اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ستمبر ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ

البرہان لاہور

جلد ۲۵، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۲۱ء/محرم الحرام ۱۴۴۳ھ

مدیر: ڈاکٹر محمد امین   نائب مدیر: پروفیسر ملک محمد حسین

مشمولات

○فکر و نظر

اے دانش مغرب — محمود شام — ۴

○تعلیم و تربیت

- سنگل نیشنل کریکولم: ایک مغالطہ — پروفیسر ملک محمد حسین — ۵
- ایک مدرسے کا انقلاب — ۱۲
- کتاب مر رہی ہے اسے بچانے میں اپنا کردار ادا کیجیے — عاصم حفیظ — ۱۴
- یکساں قومی نصاب: پرانا راگ، نیا انداز — ڈاکٹر شوکت علی — ۱۶

○تزکیۂ نفس

- مرتے ہوئے کلمہ کیوں نصیب نہیں ہوتا؟ — ادارہ — ۲۰
- حجرۂ نبوی: عروج کا سمبل — سید خالد جامعی — ۲۱

○پاکستانیات

یادگارِ پاکستان حادثہ - حکومت سارے پہلو سامنے رکھے — مدیر — ۲۲

○افغانستان

- عصر حاضر کا مجاہد اعظم (آخری قسط) — ادارہ — ۲۳
- ملا عمرؒ کی اسلامی تحریک: ہمارے لیے رول ماڈل جدید اسلامی تحریکوں کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے — حافظ محمد موسیٰ بھٹو — ۳۸
- طالبان افغانستان کے لیے چیلنج — مدیر — ۴۲
- طالبان کی معاشی پالیسی کیا ہونی چاہیے؟ — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۴۴
- ترقی کا مغربی ماڈل اور طالبان — سید خالد جامعی — ۵۰
- افغان انقلاب: پاکستان پر اثرات — ڈاکٹر محمد امین — ۵۳

○استفسارات

اسلامی تحریکیں کیوں کامیاب نہیں ہو سکیں؟ — مدیر — ۵۷

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

پروفیسر ملک محمد حسین

سید خالد جامعی

حافظ عمران رضا طحاوی

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 45 روپے
سالانہ 500 روپے۔ پانچ سال: 2000 روپے
تاحیات 10,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
A/c # 02011478219

برائے رابطہ
15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیف

خاموش انقلاب ناگزیر ہے

ریاست اگر ساتھ نہ بھی دے تو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسّی فیصد سے زیادہ اسلام پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

صفحات ۲۸۸ قیمت ۲۵۰ روپے

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیف

اسلام اور ردِّ مغرب

مغربی تہذیب خلافِ اسلام ہے اور اس کا ردّ شرعاً واجب ہے

- مغربی تہذیب کے قابل ردّ ہونے کے نو (۹) شرعی و عقلی مبسوط دلائل
- ردّ مغربی تہذیب کے موقف پر اشکالات و اعتراضات کا جائزہ
- ردّ مغربی فکر و تہذیب کے تقاضے

ڈاکٹر محمد امین

صفحات: ۲۱۶

قیمت: ۲۵۰ روپے بغیر ڈاک خرچ

مکتبہ البرہان، لاہور

فکرونظر　　محمود شام

اے دانشِ مغرب

ہیہات ہے ہیہات ہے اے دانشِ مغرب
یہ عالمِ سکرات ہے اے دانشِ مغرب

ہیگل کے جدلیات، ارسطو کے نظریات
روسو کے خیالات، برگساں کے سوالات
لوتھر کے حسیں خواب، فلاطون کے محاکات
غالب ہوئی ہر فکر پہ اک بُش کی خرافات

ہیہات ہے ہیہات ہے اے دانشِ مغرب
یہ عالمِ سکرات ہے اے دانشِ مغرب

کابل میں ہوئی دفن تری حکمتِ جمہور
قندھار میں تاراج ہوئی عظمتِ جمہور
روندی گئی غزنی میں بھی پھر شوکتِ جمہور
بٹتی رہی اشرافیہ میں دولتِ جمہور

ہیہات ہے ہیہات ہے اے دانشِ مغرب
یہ عالمِ سکرات ہے اے دانشِ مغرب

ہے خاک بسر ایشیا میں تیری بصیرت
کہسار سے ٹکراتی ہے سر تیری صذبانت
تڑپے ہے تدبر نہ کہیں فہم و فراست
زخمی ہے غرور اور ہراک چہرہ ندامت

ہیہات ہے ہیہات ہے اے دانشِ مغرب
یہ عالمِ سکرات ہے اے دانشِ مغرب

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

سنگل نیشنل کریکولم۔ایک مغالطہ

پچھلے دو اڑھائی سال سے ملک میں سرکاری پروپیگنڈے کے ذریعے ایک عظیم مغالطہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ عمران خان کی حکومت ملک میں طبقاتی نظام تعلیم کے خاتمے کے لیے پہلی بار (اور ہمارے ملک میں سیاسی حکومتیں ہر اچھا برا کام تاریخ میں پہلی مرتبہ ہی کرتی ہیں اگر چہ وہ اچھے برے کام ہماری تاریخ کے مسلسل ہونے والے کام ہوتے ہیں) واحد قومی نصاب جسے نیشنل کریکولم کی اصطلاح میں بیان کیا جاتا ہے، ملک میں نافذ کرنے جا رہی ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ پاکستان تحریک انصاف کے منشور کا حصہ ہے اور منشور کی تکمیل کے لیے ۲۰۲۳ء تک سکول سطح پر مکمل واحد قومی نصاب نافذ ہو جائے گا جو سرکاری، پرائیویٹ سکولوں اور دینی مدارس میں یکساں طور پر نافذ ہو گا۔ آیئے ہم متعدد سوالوں کے ذریعے سے حکومت کے اس جھوٹے پروپیگنڈے کا جائزہ لیں۔

پہلا سوال: پاکستان تحریک انصاف کے تعلیمی منشور میں کیا درج ہے؟

پاکستان تحریک انصاف کے تعلیمی منشور میں یکساں نظامِ تعلیم رائج کرنے کا وعدہ درج ہے۔ یکساں نظامِ تعلیم سے مراد ملک کے تمام بچوں کے لیے (غریبوں اور امیروں کی تمیز کے بغیر) ایک جیسی تعلیمی سہولیات، ایک جیسا تعلیمی ماحول، ایک جیسے تعلیم یافتہ اساتذہ، ایک جیسا نظامِ امتحان اور بلا شبہ ایک جیسا نصاب اور درسی کتب ہے۔ اب حکومت باقی تمام امور کو ایک طرف رکھتے ہوئے محض ایک جیسا قومی نصاب کا نعرہ لگا کر پروپیگنڈہ کر رہی ہے کہ وہ اس طرح طبقاتی نظام تعلیم ختم کر دے گی اور ملک میں امیر اور غریب کے درمیان تعلیمی امتیاز ختم ہو جائے گا۔

دوسرا سوال: کیا واحد قومی نصاب ملک میں پہلی بار نافذ کیا جا رہا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ پاکستان میں تو ہمیشہ سے واحد قومی نصاب ہی نافذ رہا ہے کیونکہ یہ آئین کا تقاضا تھا اور ۱۹۷۶ء کا تعلیمی ایکٹ اس کو قانونی بنیاد فراہم کرتا تھا۔ البتہ ۱۷ ویں ترمیم کے بعد نصاب، کتاب اور نظامِ امتحان کنکرنٹ لسٹ سے نکال کر صوبائی اختیار میں دے دیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اٹھارہویں ترمیم کے بعد بھی پورے ملک میں یعنی تمام صوبوں میں

۲۰۰۶ء کا بنایا ہوا قومی تعلیمی نصاب ہی نافذ رہا۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ملک میں ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک واحد قومی تعلیمی نصاب ہی نافذ رہا ہے تو ہماری اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ تمام سرکاری سکولوں میں، ان تمام پرائیویٹ سکولوں میں جو پانچویں، آٹھویں، میٹرک اور انٹرمیڈیٹ سرکاری امتحان میں اپنے طلبا کو بٹھاتے ہیں اور ان تمام دینی مدارس میں جو درس نظامی کے ساتھ اپنے طلباء کو میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان دلواتے ہیں، سرکاری سطح پر تیار کردہ واحد قومی تعلیمی نصاب اور ٹیکسٹ بک بورڈز کی شائع کردہ درسی کتب ہی استعمال ہوتی ہیں۔ البتہ وہ سرکاری، نیم سرکاری، عسکری اور پرائیویٹ تعلیمی ادارے جو اے لیول، اولیول سمیت بیرونی تعلیمی بورڈ کے امتحان دلواتے ہیں وہ واحد قومی نصاب تعلیم کی بجائے بیرونی تعلیمی ایجنسیوں کا نصاب اور ان کی درسی کتب استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ملک میں پہلی مرتبہ واحد قومی نصاب تعلیم رائج کیا جارہا ہے بالکل غلط اور صریح دھوکا ہے۔

تیسرا سوال: سنگل نیشنل کریکولم یا واحد قومی نصاب تعلیم کے نام پر جو کچھ قوم کے سامنے رکھا جارہا ہے کیا وہ واقعی سنگل نیشنل کریکولم ہی ہے؟

اور کیا یہ نصاب نئی بنیادوں پر تیار کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہے۔ ملک کے تمام ماہرین تعلیم کا اس پر اتفاق ہے کہ سنگل نیشنل کریکولم کے نام پر جو نصاب لانچ کیا گیا ہے وہ دراصل ۲۰۰۶ء کا قومی نصاب ہی ہے جو جرمنی کے بین الاقوامی ترقی کے ادارے جی آئی زیڈ (GIZ) کی فنڈنگ اور تکنیکی معاونت سے تیار کیا گیا تھا اور جس کی انچارج محترمہ نگہت لون تھی۔ اب سنگل نیشنل کریکولم کے نام سے ۲۰۰۶ء کا ترمیم شدہ نصاب سامنے لایا گیا ہے اس کی ٹیکنیکل ایڈوائزر بھی وہی محترمہ نگہت لون صاحبہ ہیں۔ نصابی ماہرین موازنہ کرکے بتاتے ہیں کہ سنگل نیشنل کریکولم ۲۰۰۶ء کے نصاب سے زیادہ سے زیادہ دس فیصد مختلف ہے۔ پچھلے دنوں مؤخر روزنامہ دی نیوز نے بھی اپنے اداریے میں اس امر کا اظہار کیا کہ سنگل نیشنل کریکولم بنیادی طور پر ۲۰۰۶ء کا نصاب ہی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ سنگل نیشنل کریکولم کی حقیقت کیا ہے تو محترم وزیر تعلیم کے متعدد بیانات اور نیشنل کریکولم کونسل کے ذمہ دارات کی توجیحات اس بات کی شاہد ہیں کہ سنگل نیشنل کریکولم محض کم

سے کم تعلیمی مواد (Minimum Learning Level) کا تعین کرتا ہے۔ تعلیمی ادارے آزاد ہیں کہ وہ زائد مواد جو اپنے طلباء کو پڑھانا چاہیں پڑھا سکتے ہیں اور اپنی پسند کی درسی کتب رائج کر سکتے ہیں بشرطیکہ ان کتب میں سنگل نیشنل کریکولم کا تعین کردہ مواد بھی آ گیا ہو اور ان کتب کے لیے این او سی (NOC) مجاز ادارے سے لے لیا گیا ہو۔

چوتھا سوال: کیا سنگل نیشنل کریکولم کے نفاذ کے بعد نظامِ تعلیم میں کوئی فرق پڑے گا؟

جواب یہ ہے کہ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جو صوبے اس کو اختیار کریں گے ان کے زیر اہتمام سرکاری سکول لازماً اس نصاب کو استعمال کریں گے لیکن اگر کوئی صوبہ اپنے آئینی اختیار کے تحت مذکورہ نصاب رائج نہیں کرتا تو اس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ پرائیویٹ سکول جو مختلف سطحوں کے سرکاری امتحانات میں اپنے طلباء کو بٹھا کر سرکاری تعلیمی سندات لینا چاہیں گے وہ سنگل نیشنل کریکولم کے مطابق ہی اپنے طلباء کو پڑھائیں گے لیکن جو پرائیویٹ تعلیمی ادارے یا سرکاری، نیم سرکاری تعلیمی ادارے، عسکری انتظام میں چلنے والے ادارے، کیڈٹ کالجز وغیرہ جو او لیول، اے لیول یا دیگر بیرونی امتحانات میں اپنے طلباء کو بٹھائیں گے وہ سنگل نیشنل کریکولم کے نفاذ سے مستثنیٰ ہوں گے اور وہ کیمبرج، آکسفورڈ یا متعلقہ بورڈ کا نصاب اور کتابیں استعمال کریں گے۔

دینی مدارس بھی جو درس نظامی کے علاوہ اپنے طلباء کو میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات دلوانا چاہیں گے وہ تو گورنمنٹ کا سنگل نیشنل کریکولم (جیسا کہ پہلے ہوتا تھا) استعمال کریں گے لیکن اگر وہ اپنے طلباء کو میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی سندات نہ دلوانا چاہیں تو ظاہر ہے وہ سرکاری واحد قومی نصاب نہیں پڑھیں گے۔

درج بالا سطور میں ہماری معروضات کی روشنی میں ہر صاحب عقل بلکہ عقل کا کورا بھی یہ جان سکتا ہے کہ شعبۂ تعلیم میں نصاب اور درسی کتب کے حوالے سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ محض جھوٹ اور پروپیگنڈہ ہے جب کہ بے خبر اور بیچارے وزیراعظم سے مورخہ ۱۶/اگست کو وزیراعظم ہاؤس کی ایک تقریب میں سنگل نیشنل کریکولم لانچ بھی کروایا گیا ہے۔ دو دن سے ٹی وی چینلز پر وزیر تعلیم کی پریس کانفرنس کے حوالے سے پروپیگنڈہ بھی چل رہا ہے اور ۱۶/اگست ''صبحِ پاکستان'' کے پروگرام میں پی ٹی وی پر ایک بے خبر پارلیمانی سیکریٹری برائے تعلیم کا انٹرویو بھی آن ایئر ہے جس میں سنگل نیشنل کریکولم کی برکات گنوائی گئی ہیں۔

پانچواں سوال: سنگل نیشنل کریکولم میں ناظرہ قرآن اور ترجمۂ قرآن کو لازمی کرنے کی حقیقت کیا ہے؟

کہا یہ جارہا ہے کہ ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سکول لیول پر ناظرہ قرآن اور ترجمہ قرآن نصاب میں لازمی قرار دیا گیا ہے حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ ناظرہ قرآن کی لازمی تعلیم جنرل ایوب کے دورِ حکومت میں ۱۹۶۰ء میں نافذ کی گئی تھی۔ پانچویں جماعت تک ناظرہ قرآن لازمی تھا۔ ایوب حکومت نے گرمیوں کی تعطیلات میں تین سال تک تمام پرائمری اساتذہ کی قریبی دینی مدارس میں قرآت وتجوید کی تربیت کرائی، سکولوں میں ۲۰ منٹ کا زیرو پیریڈ ٹائم ٹیبل میں شامل کیا گیا اور اساتذہ کے تربیتی اداروں میں امیدواران کے لیے ناظرہ قرآن میں قابلیت داخلے کے لیے لازمی قرار دی گئی۔ بعدازاں بےنظیر نے اپنے دوسرے دورِ حکومت میں اساتذہ کے تربیتی اداروں میں قرآن کی تعلیم کے لیے باقاعدہ ڈائریکٹو جاری کیا۔ مسلم لیگ (ن) کی حکومت نے ۱۹۹۸ء میں بارہویں جماعت تک ترجمۂ قرآن ایک انتظامی حکم کے ذریعے اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف نے لازمی قرار دیا اور اس کے نفاذ کے لیے وزیراعظم کے دفتر میں ایک سیل قائم کیا جس کے انچارج میجر جنرل سکندر حیات اور جسٹس ریٹائرڈ عبدالحفیظ چیمہ صاحب تھے۔ ۱۹۹۹ء میں نواز شریف حکومت ختم ہونے کی وجہ سے یہ منصوبہ شرمندۂ تکمیل نہ ہوسکا۔ مسلم لیگ (ن) کی حکومت نے ۲۰۱۷ء میں پارلیمنٹ سے ایک قانون منظور کرایا جس کے مطابق پانچویں جماعت تک ناظرہ قرآن اور بارہویں جماعت تک ترجمہ قرآن لازمی قرار دیا گیا۔ تحریک انصاف کی حکومت کو تو اس قانون کی وجہ سے بارہویں جماعت تک تدریس القرآن کو لازمی حیثیت دینا پڑی۔ درحقیقت ناظرہ قرآن ۱۹۶۰ء سے سکولوں میں لازمی ہے اور ترجمہ قرآن پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت مسلم لیگ (ن) نے لازمی قرار دیا تھا لہٰذا یہ مبارک کام ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ نہیں ہورہا۔ ویسے بھی قرآن کی تعلیم آئین کے آرٹیکل 31 کے مطابق تمام مسلمان شہریوں کے لیے لازمی ہے۔

تدریس القرآن کے معاملے میں اب کوتاہی یہ ہورہی ہے کہ ہر روز زیرو پریڈ کی بجائے ہفتے میں تین پیریڈ دیے گئے ہیں نیز قرآن کی تدریس کے لیے کوئی اضافی استاد نہیں دیا جارہا اور نہ ہی موجود اساتذہ کی تربیت کا کوئی انتظام کیا گیا ہے۔

چھٹا سوال: کیا سنگل نیشنل کریکولم سے کوئی فرق پڑا ہے؟

جی یقیناً فرق پڑا ہے۔ فرق یہ پڑا ہے کہ سیکولر لابی کی کوششیں آگے بڑھی ہیں۔ اسلامیات کے مضامین کو ایک طرف رکھتے ہوئے باقی مضامین میں سے اسلامی مواد کافی حد تک نکال دیا گیا ہے۔ حمد اور نعت اور رسول اللہ ﷺ پر اردو یا انگریزی کی درسی کتابوں میں جو ایک آدھ مضمون باقی رہ گیا ہے اس کے خلاف بھی سیکولر لبرل لابی متحرک ہے۔ اسلامیات کا نصاب بھی ان کا ہدف ہے حالانکہ یہ وہی نصاب ہے جو ۲۰۰۶ء سے رائج ہے اور حالیہ تعلیمی سیشن تک تمام صوبوں میں رائج تھا۔ سیکولر لابی کا الزام یہ ہے کہ اسلامیات کا موجودہ نصاب تو دینی اداروں کے اسلامی نصاب سے بھی زیادہ ہے حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہے اور یہ طلباء کو اسلامی زندگی گزارنے کے قابل بنانے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔

اقلیتوں کے نام نہاد نمائندے یو ایس کمیشن برائے انٹرنیشنل ریلیجس فریڈم کی پشت پناہی سے اور دیگر بین الاقوامی ایجنسیوں کی اشیر باد سے درسی کتب سے اسلامی مواد کے اخراج کے لیے شور و غوغا کرتے رہے ہیں اور کامیاب بھی رہے ہیں۔ ۲۰۱۵ء سے ۲۰۱۹ء تک درسی کتب سے ۷۰ اسلامی تصورات خارج کرائے گئے اور باقی جو بچا ہے اس کے اخراج کے لیے کوشش جاری ہے حتیٰ کہ سپریم کورٹ تک رسائی کی گئی ہے اور اس سلسلہ کا ایک کیس سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے جس میں استدعا کی گئی ہے کہ درسی کتب میں اسلامی مواد کا ہونا اقلیتوں کے حقوق کی نفی ہے لہٰذا اسے خارج کیا جائے۔

ایک اور فرق جو پڑا ہے وہ یہ کہ نصاب اور درسی کتب میں سے اسلامی اقدار (اگر کہیں تھیں) کو ختم کر کے ہیومنزم کی سیکولر اقدار کو نصاب اور درسی مواد کے تانے بانے میں شامل کرنے کا راستہ نکالا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ بر برطانیہ کی ایک انٹرنیشنل این جی او جو ہم جیسے ملکوں میں آلودگی سے پاک پانی مہیا کرنے کے لیے کام کرتی ہے اور جس کا نام واٹر ایڈ (Water Aid) ہے، اس این جی او نے اپنی فنڈنگ اور تکنیکی معاونت فراہم کر کے وفاقی وزارتِ تعلیم کو ویلیوز ایجوکیشن (اقدار کی تعلیم) کے نام سے پہلی سے بارہویں تک نصاب بنا کر دیا ہے جس کی بنیاد ہیومنزم کی سیکولر اقدار ہیں اور جن کا مقصد آلودگی سے پاک پانی کی طرح اسلامی اقدار کی آلودگی (خاکم بدہن) سے پاک نصاب اور درسی کتب پاکستانی بچوں کو فراہم کرنا ہے۔ سیکولر اقدار کو

سمونے کی یہ کوشش کتنی کامیاب ہوئی ہے اس کا اندازہ چند سال بعد ہوگا جب سنگل نیشنل کریکولم نفاذ کے بعد اپنے گل کھلائے گا۔ مجھے یقین یہ ہے کہ پاکستان کے باغیرت اساتذہ اس کوشش کو ناکام بنائیں گے لیکن ڈر یہ ہے کہ چونکہ سنگل نیشنل کریکولم کے لیے ٹریننگ کا مواد آغا خان یونیورسٹی سے بنوایا گیا ہے اور امریکہ نے بھی ہزاروں اساتذہ کو امریکہ بلا کر ٹریننگ کا اہتمام کیا ہے اس لیے شاید واٹر ایڈ کی کوشش کامیاب ہو جائے۔

ساتواں سوال: یہ تو جو کچھ ہو رہا ہے سیکولر لابی کر رہی ہے لیکن ہمیں دکھ کس بات کا ہے؟

ہمیں دکھ اس بات کا ہے کہ ریاست مدینہ کا حکمران اپنی بے خبری میں یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کے وژن کی تکمیل ہو رہی ہے۔ جھوٹا پروپیگنڈہ زوروں پر ہے۔ دوسری طرف اسلامی لابی بالکل لاتعلق ہے۔ بلکہ اسلامی لابی کے بعض حلقے اس جھوٹ اور مغالطے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اسلامی لابی کے بعض حلقے باقاعدہ معاونت کر رہے ہیں۔ سیکولر لابی قدم بقدم آگے بڑھ رہی ہے۔ کامیابیوں پہ کامیابی حاصل کر رہی ہے۔ وزیر تعلیم محترم سیکولر لابی کے سرپرست ہیں۔ نیشنل کریکولم کونسل سیکولر لبرل لوگوں کا گڑھ ہے۔ نیشنل کریکولم کونسل میں ٹیکنیکل ایڈوائزر اور کنسلٹنٹس (Consultants) کے نام پر لبرل سیکولر لوگ بھرے ہوئے ہیں۔ اور وہ اندر کی خبریں باہر کی لابی کو دے کر اخباروں میں زہر یلے مضامین لکھواتے ہیں۔ دوسری طرف ہم جیسے محب وطن اور محب اسلام اساتذہ کو نکو بنا دیا گیا ہے۔ اسلامسٹ لابی اور اسلامی جماعتیں پتہ نہیں کس کام میں مشغول ہیں کہ تعلیم جیسا بنیادی مسئلہ ان کی ترجیحات میں شامل نہیں ہو پاتا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ تعلیم جو کسی قوم کی لائف لائن ہوتی ہے وہ بتدریج دشمنوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے اور اس سلسلہ میں میں کسی کو احساس زیاں بھی نہیں ہے۔

آٹھواں سوال: سنگل نیشنل کریکولم کے حوالے سے کیے گئے دعووں کی حقیقت کیا ہے؟

سنگل نیشنل کریکولم کے حوالے سے دعوے کیے جا رہے ہیں کہ اس سے طلباء میں تنقیدی سوچ، تخلیقی صلاحتیں اور عملی کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس نصاب کے پڑھنے سے برداشت، رواداری اور مل جل کر رہنے کی سوچ پروان پڑھے گی۔ یہ سب خوبصورت سیکولر اصطلاحات ہیں لیکن کیا درسی مواد، تدریسی حکمت عملی اور سکولوں کا ماحول ان دعووں کو سپورٹ کرے گا اور کیا اساتذہ کرام ان دعووں کے حصول کے لیے کام کر سکیں گے؟ یہ مستقبل ہی بتائے گا لیکن آثار اور

تنقیدی حکمت عملی ان دعووں کی تصدیق نہیں کرتی۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ معیارِ تعلیم بلند ہو گا لیکن یہ نہیں بتایا جا رہا کہ جب یہی نصاب ۲۰۰۶ء سے نافذ ہے تو اس نصاب کے ذریعے انہی اساتذہ کے ساتھ پہلے والے ماحول میں معیارِ تعلیم بلند کیسے ہو گا؟

ماہرین تعلیم اور اساتذہ کی مخالفت کے باوجود ریاضی اور سائنس کے لیے ذریعہ تعلیم انگریزی رکھا گیا ہے جبکہ سرکاری پرائمری سکولوں اور گلی محلے میں کھلے پرائیویٹ سکولوں کے اساتذہ میں انگریزی میں پڑھانے کی استعداد نہیں ہے نیز جو تربیت اساتذہ کے پروگرام کیے گئے ہیں ان میں درسی مواد کا لحاظ رکھے بغیر جنرل ٹریننگ کی گئی ہے اور وہ بھی آن لائن۔ سرکاری سکولوں کے اساتذہ اس ٹریننگ سے بالکل مطمئن نہیں ہیں اور نہ ہی وہ ریاضی اور سائنس کو انگریزی میں پڑھانے کے لیے اپنے آپ کو اہل پاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ طالب علم ریاضی اور سائنس میں پس ماندہ رہ جائیں گے۔

فیصلہ سازوں کو سوچنا چاہیے کہ ہمارے چوٹی کے سائنسدان جن میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان ثمر مبارک مند، ڈاکٹر عبدالسلام نوبل انعام یافتہ، ایٹمی اور میزائل سسٹم کے ماہرین، زراعت، جنیٹک انجینئرنگ کے ماہرین، یونیورسٹیوں کے موجودہ ذہین ترین وائس چانسلرز مثلاً ڈاکٹر نیاز احمد اختر، ڈاکٹر ضیاء القیوم، ڈاکٹر مجاہد کامران وغیرہ سارے اردو میڈیم سکولوں کے پڑھے ہوئے ہیں اور انگلش میڈیم سکولوں کے پڑھے ہوئے بیوروکریٹ اور جرنیل تو شاید چند ایک ہوں گے لیکن کوئی ایک بھی نامور سائنس دان نہیں ہے تو سنگل نیشنل کریکولم میں سائنس اور ریاضی کی درسی کتب انگریزی میں کیوں رکھی گئیں؟ انگلش میڈیم کے اس احمقانہ فیصلے سے طبقہ واریت اور بڑھے گی۔ صاف نظر آتا ہے کہ محترم وزیر تعلیم نے پرائیویٹ سکولوں کی اپنی لابی کو مطمئن کرنے کے لیے یہ غلط فیصلہ کیا ہے جب کہ پرائیویٹ سکول سرکاری نصاب اور سرکاری درسی کتب رائج کرنے سے انکاری ہیں اور حکومت کے فیصلوں کے خلاف ہائی کورٹ میں پٹیشن لے کر چلے گئے ہیں اور شاید انہیں ریلیف بھی مل گیا ہے۔ حکومت سے استدعا ہے کہ وہ اپنے غلط اور یک طرفہ فیصلوں پر نظر ثانی کرے اور قومی تعلیم کے نظام کو مزید خراب نہ کرے۔ ان اقدامات سے معیارِ تعلیم گرے گا اور تعلیمی اداروں میں انتشار بڑھے گا۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

ایک مدرسے کا انقلاب

کہنے کو تو دارالعلوم دیوبند ایک مدرسہ ہے لیکن اس کے اثرات اتنے وسیع ہیں کہ ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ برما سے لے کر دریائے آمو تک چھ سات ممالک اور علاقوں میں جن میں برما، بنگلہ دیش، بھارت، کشمیر، نیپال، پاکستان افغانستان شامل ہیں، مدارس کا ایک سلسلہ ہے جو دارلعلوم دیوبند کی علمی اولاد ہیں۔ ان مدارس سے فارغ التحصیل علمائے کرام ہزاروں مدرسوں اور لاکھوں مساجد کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ ہندو پاکستان اور افغانستان میں بعض دینی مدارس اتنے بڑے ہیں کہ اپنے جدامجد کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ دیوبند نے جمعیت علمائے ہند پیدا کی۔ اس میں سے جمعیت علمائے اسلام پیدا ہوئی۔ تبلیغی جماعت کے لاکھوں بلکہ کروڑوں کارکن اور بستر پیٹھ پر لادے ساری دنیا میں رواں دواں اللہ کے بندے دارالعلوم دیوبند کے علماء اور طلباء کی دین ہیں۔ پاکستان کے بڑے بڑے مدارس سے اور افغانستان کے مدارس سے فارغ التحصیل علماء جو اب اصطلاحاً طالبان کہلاتے ہیں، ایک عجیب وغریب طاقت کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ پورا یورپ اور امریکہ نیٹو فوجی اتحاد کے ساتھ طالبان کے ساتھ نبرد آزما ہوئے اور اپنی پوری فوجی طاقت، ٹیکنالوجی اور اسلحے کے ساتھ افغانستان سے اس طرح ذلیل وخوار ہو کر نکلے کہ چشم فلک نے شاید ہی کبھی ایسا نظارہ کیا ہو۔

دارالعلوم دیوبند اور پاک وہند وافغانستان میں اس کی اولاد نے جو دینی عصبیت افغان طالبان میں پیدا کی وہ آخر سرخرو ہو کر جیت گئی۔ ابن خلدون کی یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ عصبیت آخر جیت جاتی ہے اور ہر طرح کی عصبیتوں میں دینی عصبیت سب سے زیادہ طاقتور عصبیت ہوتی ہے کیونکہ اس عصبیت کی پشت پر اللہ ربّ العزت کی تائید ہوتی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک مدرسے نے وہ کام کر دکھایا جو سیاسی علوم، سماجی علوم اور عالم انسان کی تاریخ میں ایک بے مثال کام ہے۔ کیا پاکستان کے مسلمان اس بات پر غور کریں گے کہ ایک مدرسہ نے انسانی تاریخ میں اتنا بڑا انقلاب برپا کیا کہ دنیا کی پُرہیبت طاقتیں اپنی سائنس، ٹیکنالوجی، جنگی مشین اور جنگی مہارت کے باوجود شرمناک شکست سے دوچار ہوئی حتیٰ کہ ۱۹۰ ارب ڈالر سے کھڑی کی گئی ۳ لاکھ

کی نفری پر مشتمل افغان فوج جو امریکہ ۲۰ سال تک تیار کرتا رہا یوں تتر بتر ہوئی کہ ان کا کوئی نشان بھی نہیں ملتا اور صرف ۶۰ ہزار نہتے افغان طالبان مانگے تانگے اور چھینے ہوئے اسلحے کے ساتھ ایسا سونامی ثابت ہوئے کہ افغانستان کے ۳۴ صوبے ڈھیر ہو گئے ہیں اور کابل تو طالبان کے قدموں میں ایسے ڈھیر ہوا کہ طالبان ابھی کہیں دور ہی تھے کہ کابل کی شاہراہیں استقبال کے لیے چشم براہ تھیں۔ ہے نہ کمال ایک مدرسے کا۔

کیا پاکستان کے دینی فرزند چاہے وہ جمعیت علماء اسلام کی شکل میں ہوں یا جماعت اسلامی کی شکل میں، چاہے وہ تحریک لبیک کی شکل میں ہوں یا جمعیت اہل حدیث کی شکل میں کیا وہ اللہ اور اللہ کے دین کی حکمرانی یعنی قرآن وسنت کی حکمرانی کی عصبیت اپنے دل ودماغ پر طاری کر کے محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے اکٹھے ہو کر اللہ کی حکمرانی، اللہ کے دین کی حکمرانی، قرآن وسنت کی حکمرانی کے لیے میدان میں نکلیں گے اور اگر وہ متحد ہو کر نکلیں گے تو کامیابی ان کے قدم چومے گی اور ہر قسم کی مقتدر قوتیں ان کے سامنے خس وخاشاک کی طرح بہہ جائیں گی، ان شاء اللہ۔

بقیہ: افغان انقلاب - پاکستان پر اثرات

جہاں تک تحریک طالبان پاکستان کا تعلق ہے تو اس کا ذکر بھی یہاں بے محل ہے کیونکہ یہ تحریک بنیادی طور پر نفاذ شریعت کی تحریک تھی ہی نہیں بلکہ اس وقت وجود میں آئی تھی جب پاکستانی فوج نے مشرف دور میں انہیں جہاد افغانستان میں حصہ لینے سے قوت سے روکا تو وہ مجبوراً پاکستانی فوج سے بھڑ گئے۔ بعد میں امریکہ اور بھارت نے اس میں اپنے آدمی داخل کر کے اسے اغوا کر لیا اور اسے اسلحہ، تربیت اور پیسے دے کر پاکستان کے خلاف دہشت گردانہ کاروائیوں پر لگا دیا تاکہ پاکستان اور اس کی فوج کو کمزور کیا جا سکے اور الحمد للہ اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔ لہٰذا اس امر کا نہ کوئی شرعی جواز ہے اور نہ عقلی کہ پاکستان میں بزور بازو شریعت نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لیے پاکستانی حکومت اور فوج سے لڑائی کی جائے اور اس کی سند طالبان افغان کے دفاعی جہاد سے لی جائے۔

تعلیم و تربیت　　　عاصم حفیظ

کتاب مر رہی ہے
اسے بچانے میں اپنا کردار ادا کیجیے

کتاب طباعت سے آراستہ ہو کر آتی ہے، تو اس میں کئی مزدورانِ قلم وقرطاس کے خون پسینے اور کئی ایک اصحاب ثروت کے خزینے شامل ہوتے ہیں۔

بالآخر کتاب منصۂ شہود پر آتی ہے، اخراجات اور محنت کا حساب لگا کر ہزاروں لاکھوں روپے کو چند سو یا ہزار نسخوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک نسخہ کی قیمت مقرر کی جاتی ہے تا کہ مصنف کی محنت اور ناشر کی دولت کا کچھ نہ کچھ صلہ انہیں مل سکے۔

لیکن ہوتا یوں ہے کہ کتاب آنے کے بعد اس میں دلچسپی لینے والے صرف دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں: ایک وہ جو اس امید میں ہیں کہ یہ کتاب انہیں ہدیتاً اور تحفتاً عنایت کر دی جائے۔ اور دوسرے وہ جو سمجھتے ہیں کہ کتاب چھپے بعد میں لیکن اس کا پی ڈی ایف لنک اس سے پہلے ہی پوسٹ کر کے ان کی خدمت میں پہنچ جانا چاہیے۔

اور کتاب کو خریدنے والا کون ہے؟ کدھر ہے؟ جی جناب! وہ برگر، شوارمے، مٹن کڑاہیاں، مہنگی گھڑیاں اور موبائل لینے میں مصروف ہے۔ چار پانچ سو، ہزار کی کتاب جسے بہت مہنگی لگتی ہے لیکن دو چار سو، ہزار کی فاسٹ فوڈ اور دو چار ہزار کی مٹن کڑاہی اس کے لیے ایک معمول کی بات ہے۔

سوچیے! اگر ہم اسی طرح کرتے رہیں گے، تو وہ کتابیں جو پہلے گیارہ سو کی تعداد میں چھپتی تھیں، اب دو تین سو کی تعداد میں چھپ رہی ہیں۔ علم معاشرے سے اٹھ رہا ہے جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء، محققین و مصنفین کی باقاعدہ سرپرستی اور معاشی کفالت کی جائے۔ اس دور میں آپ ان کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے تو نہ کریں لیکن ان کی کتابوں کو تو خرید لیا کریں۔ خود نہیں پڑھنی تو نہ پڑھیں، خرید کر کسی کو دے دیں، کسی مسجد میں رکھوا دیں، کسی لائبریری کو ہدیہ کر دیں۔ ہزاروں کے پرفیوم، سیکڑوں کے گلدستہ لے کر تحفے تحائف کے طور پر دینے کی بجائے کتابیں خرید کر ایک دوسرے کو دیں۔ اور بتائیں کہ کتاب خریدنا، کتاب کے فروغ کا ذریعہ ہے، لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہے، علماء کی قدر دانی ہے۔

غور فرمایئے! اس جدید ترین دور میں جب ہر چیز نیٹ پر ملتی ہے، کتاب بھی نیٹ پر دستیاب ہونی چاہیے، پی ڈی ایف میں میسر ہونی چاہیے۔ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کو وقت کی یہ ضرورت سمجھ آگئی ہے، لیکن کیا یہ ساری ذمہ داری صرف علماء و مصنفین کی ہے کہ وہ عرق ریزی کر کے نیٹ پر ڈالتے رہیں؟

جناب! آئیں، ہم سب پی ڈی ایف والے بھائی اور تحفتاً کتابیں تلاش کرنے والے بھائی فنڈ اکٹھا کریں، مصنف و ناشر کو اس کا حق الخدمت دیں اور کتاب پی ڈی ایف بنانے والوں کے سپرد کر دیں۔ اگر چالیس پچاس لوگ ہدیے لینے والے ہیں، تو اتنی تعداد میں ہدیہ دینے والے بھی تو ہونے چاہئیں جو مصنف سے کتاب خرید کر دوسروں کو ہدیہ کریں۔ آخر یہ سارا بوجھ اور ذمہ داری ہم نے اسی شخص/ اشخاص پر کیوں ڈال دی ہے جو اس پب جی، ٹک ٹاک اور سوشل میڈیائی معاشرے میں قلم و قرطاس کی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں؟

علماء کا ایک خادم ہونے کی حیثیت سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے علماء کی خدمت اور حوصلہ افزائی کے لیے مختلف انداز سے کام شروع کیا ہوا ہے۔ ہم کئی ایک علماء کے ساتھ مالی تعاون کرتے ہیں۔ مصنفین، علماء اور کتاب دوست سوشل میڈیا کے نام سے ہمارے دو گروپ بھی ہیں، لیکن دن بہ دن ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ کہ اگر ہم علماء کے ساتھ کوئی اضافی تعاون نہ بھی کریں، ان کی محنت کا ہی مناسب معاوضہ انہیں دے دیں، تو علماء کے بہت سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

مثلاً ہم کسی مصنف یا محقق کی کفالت کی ذمہ داری نہ لیں، لیکن کتاب کی مارکیٹنگ، ترسیل اور خرید و فروخت کے نظام کو ہی بحال کر دیں، تو یہ بھی علماء کے ساتھ تعاون کی ایک بہت بڑی صورت ہے۔ اور اگر ہم ایسا نہیں کر پاتے تو گویا ہم علماء کے ساتھ تعاون تو دور کی بات، ان کا وہ خون پسینہ چوسنے والے ہیں، جو انہوں نے علم کی خدمت میں، معاشرے کی بہتری میں اور رب کی رضا کے لیے بہایا ہے۔ ہم علماء کو کھلانے والے نہیں، بلکہ ان کا اور ان کے بچوں کا حق کھانے والے ہیں۔ ہم علم کے لیے، دین کے لیے، فتنوں کے سدباب کے لیے، معاشرتی مسائل کے حل کے لیے، باطل کا ناطقہ بند کرنے کے لیے قربانی چاہتے ہیں لیکن صرف علماء سے، ہم خود اس مشن میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد ہونے کی حیثیت سے اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

تعلیم و تربیت

پروفیسر ڈاکٹر شوکت علی[1]

یکساں قومی نصاب۔ پرانا راگ، نیا انداز

تحریک انصاف کا انتخابی منشور اور انتخابی تعلیمی پالیسی اس وقت میرے سامنے ہے۔ تعلیمی پالیسی کے صفحہ نمبر 22 پر پاکستان میں ذریعۂ تعلیم کے حوالے سے پالیسی نکات موجود ہیں۔ پالیسی میں وعدہ کیا گیا تھا کہ پاکستان میں آٹھویں جماعت تک تعلیم اردو یا مادری زبان میں ہوگی۔ البتہ اردو اور انگلش، لازمی مضامین کے طور پر پڑھانے کا ذکر تھا۔

اعلیٰ تعلیم (گریجوایشن و پوسٹ گریجوایشن) کے حوالے سے وعدہ یہ تھا کہ وقتی طور پر ذریعہ تعلیم انگلش ہوگا جسے بتدریج اردو میں منتقل کر دیا جائے گا۔ پالیسی میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ جنرل اور پروفیشنل یونیورسٹیوں کے نصاب اور نصابی کتب، اردو زبان میں ڈھالی جائیں گی تاکہ اردو کو حتمی ذریعہ تعلیم کے طور پر نافذ کیا جا سکے۔

پالیسی کے مطابق، کلاس 9 سے کلاس 12 تک ذریعۂ تعلیم ملا جلا رکھنے کا ذکر تھا، جسے اعلیٰ تعلیم کی تدریس اردو زبان میں شروع ہوتے ہی اردو میں منتقل کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

مندرجہ بالا پالیسی بیانات سے واضح ہوتا تھا کہ تحریک انصاف ہر سطح پر اردو کو بطور ذریعۂ تعلیم نافذ کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ لیکن یکساں قومی نصاب کی نقاب کشائی سے پتا چلا ہے کہ تحریک انصاف اپنے وعدوں سے پیچھے ہٹ رہی ہے۔ یکساں قومی نصاب، دراصل وہی پرانی شراب ہے جسے نئی بوتل میں نیا لیبل لگا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے نہ تو ذریعۂ تعلیم کی رنگارنگی ختم ہوگی اور نہ ہی اس طبقاتی تقسیم میں کمی واقع ہونے کی خاص امید ہے، جسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے یکساں نصاب لایا جا رہا تھا۔

یکساں قومی نصاب سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو یا مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کے عالمگیر اصول کو ہمارے اربابِ اختیار نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد

کچی جماعت سے پانچویں جماعت تک تیار کیے گئے یکساں قومی نصاب میں انگلش کے ساتھ ساتھ، ریاضی اور جنرل سائنس کی کتابیں بھی انگریزی زبان میں پڑھنا لازم کردیا گیا ہے۔ ابتدائی کلاسوں میں صرف اسلامیات اور واقفیت عامہ/ معاشرتی علوم کے دو مضامین اردو میں پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے۔

ارباب اختیار کے دیگر بیانات بھی ریکارڈ پر موجود ہیں جن میں اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم، انتہائی ضروری اور ناگزیر بتایا جارہا ہے۔ یکساں قومی نصاب کے خدوخال اور اخباری بیانات کو دیکھتے ہوئے یہ بات با آسانی کہی جاسکتی ہے کہ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک، انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم نافذ کرنے کا اصولی فیصلہ کیا جاچکا ہے۔

میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس نصاب میں مختلف کیا ہے، جس کا پچھلے تین سال سے انتظار کیا جارہا تھا؟ ہمارے ہاں اکثریتی پرائیویٹ اسکول، پرائمری سطح کی اسلامیات اور معاشرتی علوم وغیرہ اردو میں ہی پڑھاتے چلے آرہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ریاضی اور سائنس کے مضامین بھی اردو میں پڑھنا لازم قرار دیے جاتے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوسکا۔ اور یہ ان تمام تر وعدوں کے باوجود نہیں ہوسکا جو تحریک انصاف نے اپنی انتخابی مہم کے دوران کیے تھے۔

چلیے جیسے بھی ہے، یکساں قومی نصاب نافذ ہوچکا ہے۔ کلاس اول سے پانچویں تک کی کتابیں سرکاری سطح پر چھپ چکی ہیں۔ توقع کی جارہی تھی کہ چاہے بچہ ایلیٹ اسکول کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھا ہو، چاہے وہ کسی سرکاری اسکول کی خستہ حال چاردیواری میں براجمان ہو، ایک ہی کتاب ہوگی جو سب پاکستانی بچوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس حوالے سے بھی صورت حال حوصلہ افزا نہیں ہے۔ فوری طور پر تو سرکاری سطح پر شائع ہونے والی کتابیں ہی دستیاب ہیں، لیکن مستقبل میں ایسا نہیں ہوگا۔ نجی پبلشرز کے لیے یہ سہولت رکھی گئی ہے کہ وہ نصاب کے مطابق کتابیں لکھ سکتے ہیں، شائع کرسکتے ہیں اور حکومتی منظوری کے بعد یہ کتابیں اسکولوں میں پڑھائی بھی جاسکتی ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ نصاب ایک ہوگا البتہ کتابیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس سادگی پر غالب کا شعر ہی پڑھا جاسکتا ہے کہ ؂

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

آپ جو بھی کہیں، جب اس فارمولے کا اطلاق ہوگا تو اس سے طبقاتی تقسیم کا وہ فرق نمایاں ہو کر لازمی سامنے آئے گا جسے ختم کرنے کے نام پر یکساں قومی نصاب کا ڈول ڈالا گیا تھا۔ نجی پبلشرز کی طرف سے چھپنے والی کتابیں، پیش کاری اور قیمت کے لحاظ سے بہت مختلف ہوں گی۔ اور یہی کھچڑی ہمارے ہاں پہلے بھی پکی ہوئی تھی جسے ناپسندیدہ قرار دے کر یکساں نصاب کا نعرہ لگایا گیا تھا۔ اب آنے والے دنوں میں پھر سے کتابوں کے انتخاب کی دوڑ لگے گی اور پرائیویٹ اسکول انہی برانڈڈ کتابوں کی آڑ میں بھاری فیسیں وصول کریں گے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ برانڈڈ کتابیں بہتر ہوں گی، میں عرض کر رہا ہوں کہ برانڈڈ کتابیں سرکاری کتابوں سے بہت مختلف ہوں گی۔ اور دراصل یہی وہ ''مختلف'' ہے جو ہمارے ملک میں ایک طبقے کی نفسیاتی ضرورت رہا ہے۔ چونکہ وہ طبقہ بااثر بھی ہے، اس لیے یکساں قومی نصاب کا دوسرا مقصد بھی فوت ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔

آیئے اب یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ یکساں قومی نصاب، دینی مدارس میں کیا تبدیلی لے کر آیا ہے؟ دینی مدارس کے تعلیمی نظام سے متعلق چونکہ آگاہی کم ہے اس لیے پہلے اس پر مختصراً بات کر لیتے ہیں۔

دینی مدارس، درسِ نظامی کی قدیم روایت پر قائم ہیں۔ وفاق المدارس پاکستان کا سب سے بڑا دینی تعلیمی بورڈ ہے، جس کے تحت 21 ہزار مدارس ہیں، جن میں 28 لاکھ سے زائد طلبا زیر تعلیم ہیں۔ درسِ نظامی کا تعلیمی پروگرام مختلف درجات پر مبنی ہے، جس میں درجہ ابتدائیہ، درجہ متوسطہ، درجہ ثانویہ عامہ، درجہ ثانویہ خاصہ، درجہ عالیہ اور درجہ عالمیہ شامل ہیں۔ درجہ ابتدائیہ پرائمری، درجہ متوسطہ مڈل، درجہ ثانویہ عامہ میٹرک، درجہ ثانویہ خاصہ ایف اے، درجہ عالیہ بی اے اور درجہ عالمیہ ایم اے کے برابر تسلیم کیے گئے ہیں۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن پاکستان (موجودہ ہائر ایجوکیشن کمیشن) 1982ء سے وفاق المدارس سے جاری کی جانے والی ڈگری شہادۃ العالمیہ کو ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کے مساوی تسلیم کرتا ہے۔

وفاق المدارس کے نصاب پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ ماضی میں بھی سائنس، ریاضی، اردو، انگریزی اور مطالعہ پاکستان جیسے مضامین دینی مدارس کے نصاب میں شامل رہے ہیں۔ اور

دینی مدارس کے طلبا انٹر بورڈ اور ہائر ایجوکیشن سے ہر سطح کی مساوی اسناد بھی حاصل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس طرح یہ کہنا کہ دینی مدارس میں جدید مضامین پڑھانے کا سہرا حالیہ یکساں قومی نصاب کے سر جاتا ہے، یہ بات کُلی طور پر درست نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ یکساں قومی نصاب کا ڈھانچہ بنانے والے صاحب اختیار، ذریعہ تعلیم کی دورنگی اور امیر غریب کے لیے الگ الگ نظام کو برقرار رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اس کامیابی پر انہیں مبارک باد پیش کی جانی چاہیے۔ اور جہاں تک بات ہے اردو ذریعہ تعلیم اور یکسانیت کی، تو اس کے لیے میں اور آپ دعا ہی کر سکتے ہیں۔ آیئے اس ملک میں موثر اور یکساں نظام تعلیم کے لیے ہم سب مل کر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

بقیہ: مرتے ہوئے کلمہ کیوں نصیب نہیں ہوتا؟

* میرے وارڈ میں ایک نوجوان گردے فیل ہونے سے مرا، تین دن تک اس پر نزع کی حالت رہی اور اتنی بری موت مرا کہ پچھلے چالیس سال سے مَیں نے ایسی موت نہیں دیکھی۔ میں ابھی بھی اس کا سوچوں تو مجھے خوف آ جاتا ہے۔ مرنے سے دو دن پہلے اس کی یہ کیفیت تھی کہ اس کا منہ نیلا ہو جاتا، آنکھیں نکل آتیں اور منہ سے دردناک آواز نکلتی جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ مرنے سے ایک روز قبل یہ حالت اتنی شدید ہوئی کہ وارڈ سے دوسرے مریض بھاگنا شروع ہو گئے۔ اس کا باپ آیا اور میری ترلے منتیں کرنے لگا کہ اس کو زہر کا انجکشن لگا دوں۔ لیکن مَیں نہیں مانا کیونکہ بحیثیت ڈاکٹر مجھے یہ زیبا نہیں تھا۔ اس نوجوان کی حالت جب برداشت سے باہر ہوئی تو اس کو ایک دوسرے کمرے میں شفٹ کیا گیا جہاں ایک دن بعد وہ اسی کربناک حالت میں مر گیا۔ بعد میں پوچھنے پر اس کے والد نے بتایا کہ یہ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے اپنی ماں کو مارا کرتا تھا اور میں اس کو بہت روکا کرتا تھا کہ بدبخت ایسا نہ کر، تیری ماں ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ بری موت اسی کا نتیجہ ہے۔

یاد رکھیں انسان مرتے وقت وہی کام کرتا ہے جس کو دنیا میں وہ زیادہ سے زیادہ کرتا ہے۔ اپنے آپ سے پوچھیئے کہ آپ کون سا کام سب سے زیادہ کرتے ہیں۔ اور وہی کام کرتے ہوئے موت آ گئی تو کیا رب کو منہ دکھا سکیں گے؟ لہٰذا چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر کرتے رہیں اور گھر میں اپنے اہل خانہ کو، دوستوں کو، اعزہ و اقرباء کو اور جس جس کو کہہ سکیں، یہی تلقین کریں۔

تزکیۂ نفس ادارہ

مرتے ہوئے کلمہ کیوں نصیب نہیں ہوتا؟
ایک ڈاکٹر کے مشاہدات وتجربات

* میرے جاننے والے ایک حافظ قرآن کی بیوی کو گردن توڑ بخار ہو گیا۔ وہ میرے وارڈ میں داخل تھیں اور علاج سے کافی افاقہ ہو رہا تھا۔ ایک دن شام کے وقت مجھے وارڈ کی نرس نے ٹیلی فون پر بتایا کہ وہ بی بی اونچی آواز میں کلمے پڑھ رہی ہیں۔ میں گھر سے بھاگا جب وارڈ میں پہنچا تو وہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ یہ مرحومہ نماز روزے کی پابند اور حافظہ بتائی جاتی تھیں۔

* ایک نوجوان دل کے مرض میں میرے پاس زیر علاج تھا۔ میں اسے دیکھنے گیا تو وہ ریڈیو پر گانے سننے میں مشغول تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اس کا مرض لاعلاج ہے، میں نے اسے قرآن پاک پڑھنے کی ترغیب دی تو کہنے لگا کہ میں حافظ قرآن ہوں، قرآن بھی پڑھتا ہوں اور گانے بھی سنتا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ کونسا کام زیادہ کرتے ہو؟ کہنے لگا گانے کو زیادہ وقت دیتا ہوں۔ جب مر رہا تھا تو منہ سے گانے کی آواز آرہی تھی، کلمہ نصیب نہ ہوا۔ کیسی بدنصیبی ہے کہ اللہ کے کلام کو گانے سے کمتر سمجھا تو موت کے وقت کلمہ جیسی عظیم نعمت سے محرومی ہوئی۔

* ایک ڈاکٹر آخری وقت میں ریڈرز ڈائجسٹ طلب کر رہا تھا اور ان کی بیگم پاس کھڑی کلمہ کی تلقین کر رہی تھیں۔ جب وہ فوت ہو گئے تو ان کی بیگم نے بتایا کہ انہیں ریڈرز ڈائجسٹ پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ کیونکہ یہ ان کی محبوب چیز تھی اس لیے موت کے وقت بھی اس کی طلب تھی۔

* ایک زمیندار موت کے وقت بار بار یہ دریافت کر رہا تھا کہ بھینس کو چارا ڈالا ہے؟ یہ شکایت جب اس کے رشتہ داروں نے آکر کی تو میں چونک اٹھا اور سمجھ لیا کہ اس کا آخری وقت ہے کیونکہ اس کی ساری زندگی بھینس اور چارے میں گزری ہے اس لیے مرتے وقت وہی چیز سامنے آئی اور کلمہ سے محروم ہو گیا۔

* ایک مریض میرے وارڈ میں داخل تھا۔ اس کا مرض یک دم شدید ہو گیا۔ میں نے نرس کو ٹیکہ لگانے کو کہا۔ نرس نے ٹیکہ لگایا تو مریض نے اسے بہت گندی گالی دی۔ اس پر نرس نے دوسرا ٹیکہ لگانے سے انکار کر دیا تو میں نے ٹیکہ لگایا تو مجھے بھی گندی گالی دی اور تھوڑی دیر بعد مر گیا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ گالی دینا اس کا تکیہ کلام تھا۔ ہر بات پر گالی دیتا، جس کی وجہ سے موت کے وقت یہی چیز نصیب ہوئی۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۹)

فہم دین

سید خالد جامعی

حجرۂ نبوی۔عروج کا سمبل

امتوں کو عروج سائنس وٹیکنالوجی سے نہیں ملتا اس لذتِ کردار سے ملتا ہے جس کی لذت دشمن بھی محسوس کرتا ہے اور دشمنی ترک کر کے محبت اختیار کر لیتا ہے۔اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے وادی مکہ کو آباد کرتے ہوئے اپنے ورثاء کے لیے اللہ سے دعا کی تھی کہ اے ربّ! لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا دے(ابراہیم:۳۷)۔اگر امتیں شان وشوکت کی حامل ہوں اور صرف ان کی ہیبت قائم ہو لیکن دلوں میں ان کے لیے محبت نہ ہو تو یہ سلطنتیں مغلیہ سلطنت کی طرح تاریخ کے گردوغبار میں گم ہو جاتی ہیں۔عیش وعشرت کی ثقافت جس نے بھی اختیار کی اس کا انجام برا ہوا، خواہ وہ دنیا دار لوگ تھے یا دین کے علمبردار۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے دنیا سے کیا کام؟ میں تو ایک مسافر کی طرح ہوں جو کچھ دیر کے لیے یہاں ٹھہر گیا ہے(ترمذی:۲۳۷۷)اور فرمایا میرے پروردگار نے مجھے یہ پیشکش کی کہ وہ بطحاء مکہ کو میرے لیے سونے کا بنا دے لیکن میں نے عرض کیا کہ پروردگار نہیں! میں ایک دن بھوکا رہوں اور ایک دن سیراب ہو جاؤں تا کہ جب بھوکا رہوں تو تیری بارگاہ میں عاجزی وزاری کروں اور تجھے یاد کروں اور جب سیراب ہوں تو تیری تعریف اور شکر ادا کروں(ترمذی:۲۳۴۷)۔

یہ اس ہستی کا طرزِ زندگی تھا جسے کون ومکان میں فضیلت دی گئی اور رحمۃ اللعالمین کا خطاب دیا گیا۔رحمۃ اللعالمین ﷺ نے اپنے لیے "الفقر الفخری" کا خطاب پسند فرمایا۔ آپ ﷺ نے فقر، سادگی، سادہ طرز زندگی اور عیش وعشرت سے گریز کو اپنے مسلسل طرزِ عمل سے ثابت کیا۔آپ ﷺ نے ساری زندگی ایک ایسے حجرہ میں بسر کی جس میں وصال مبارک کے بعد صرف تین قبریں سما سکیں۔مختصر حجرہ مبارک کی سنت پر رسول اللہ ﷺ نے متواتر عمل کر کے دکھایا۔یہ ایسی سنت تھی جس پر رسول اللہ ﷺ زندگی بھر عامل رہے اور مستقبل کے حکمرانوں اور امت مسلمہ کے لیے ایک مثال قائم فرمائی۔

ایسا کوئی سلطان زمانے میں دکھا دو   مٹی کا دیا جس کے شبستاں میں جلا ہو

پاکستانیات ڈاکٹر محمد امین

یادگارِ پاکستان حادثہ۔حکومت سارے پہلو سامنے رکھے

حکومت، میڈیا اور لادین طبقات بلاتحقیق فحاشی اور عریانی کی حمایت کر رہے ہیں
دینی عناصر کو پاکستانی معاشرے میں اخلاقی انحطاط روکنے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے

۱۔ لاہور میں لڑکی کے ساتھ جو حادثہ ہوا اس پر دو طرح کے مؤقف سامنے آئے ہیں: ایک یہ کہ لڑکی کے ساتھ ظلم ہوا لہٰذا بدقماش لوگوں کو کیفر کردار کو پہنچایا جائے۔ پورے معاشرے پر بھی لعن طعن ہو رہی ہے۔ یہ مؤقف حکومت، میڈیا اور سیکولر، لبرل اور متجدد دین کا ہے۔ دوسرا مؤقف کچھ لوگوں کا یہ ہے کہ لڑکی سادہ شریف گھریلو لڑکی نہیں تھی بلکہ ٹک ٹاکر اور سنیپ چیٹ ماڈل تھی، اس نے اپنے فالورز کو بلا رکھا تھا، اپنے پارٹنرز اور ان کے ساتھ فحش تصویریں کھنچوا رہی تھی، اس کے فالورز اور منچلے نوجوانوں کو اس نے جنسی طور پر مشتعل کیا اور انہوں نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی۔ بھارتی میڈیا نے اس بات کو اچھالا۔ اس لڑکی نے FIR میں بھی جھوٹ بولا اور مشہور ہونے کی پلاننگ کے ساتھ تاخیر سے تھانے میں رپورٹ درج کرائی۔

ہمارا مطالبہ ہے کہ حکومت کو دونوں پہلو سامنے رکھ کر تحقیق کرنی چاہیے تاکہ واضح ہو سکے کہ فساد کی جڑ لڑکی تھی یا کچھ بدقماش جو بے قابو ہو گئے تھے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ وزیر اعظم سے لے کر وزیر اعلیٰ پنجاب اور ان کے وزراء سب بلاتحقیق لڑکی کی حمایت کر رہے ہیں اور دوسرے لفظوں میں فحاشی اور عریانی کی حمایت کر رہے ہیں جبکہ زیادہ امکانات اس کے ہیں کہ لڑکی خود مجرم اور قابل سزا ہے۔ جن لڑکوں نے اسے چھیڑا بلاشبہ وہ بھی سزا کے مستحق ہیں۔

۲۔ اس واقعے کا یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ ہمارا معاشرہ ٹک ٹاکر اور یوٹیوبر لڑکیوں کو جو عموماً ناکافی اور ناموزوں لباس میں اپنی الٹی سیدھی تصویریں کھنچواتی اور اپ لوڈ کرتی ہیں، ناپسند کرتا ہے۔ کوئی باپ نہیں چاہتا کہ اس کی بیٹی ایسی حرکتیں کرے اور کوئی بھائی نہیں چاہتا کہ اس کی بہن ایسی حرکتیں کرے۔ یہ ہمارے دین، ہماری تہذیب اور ہماری ثقافت کے خلاف ہے چنانچہ اس طرح کی کئی ماڈل لڑکیاں اپنے بھائیوں اور دوسروں کے ہاتھوں قتل ہو چکی ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۴۳)

افغانستان ادارہ

عصرِ حاضر کا مجاہدِ اعظم (آخری قسط)[۱]

ملا محمد عمرؒ جس نے ۱۳ سال تک تن تنہا جہاد کی قیادت کر کے وقت کے فرعون (امریکہ و نیٹو) کو شکست دی۔
ملا عمرؒ کی فراست، للّٰہیت، کثرت ذکر و عبادت، مراقبہ اور توکل علی اللہ کے آنکھوں دیکھے حالات

شجاعت

انس حقانی کہتے ہیں کہ میرے والد (معروف مجاہد رہنما) مولوی جلال الدین حقانیؒ نے ایک دفعہ ایک یادگار واقعہ ہمیں سنایا کہ: ''امیر المومنینؒ کے بہت سارے کردار میرے پسندیدہ تھے، ان میں سے ایک دلیری اور شجاعت تھی، جو مجھے سب سے زیادہ پسند تھی۔ وہ بہت دلیر انسان تھے، میں نے ان سے جو بیعت کی تھی اس کی وجہ بھی ان کی شجاعت اور دلیری تھی۔ امریکی جارحیت کے ابتدائی دنوں میں جب کابل شہر پر امریکہ کے بی 52 طیارے فضائی حملے کر رہے تھے، ہر طرف خوف و ہراس پھیل گیا تھا اور کابل سے مجاہدین پسپائی اختیار کر رہے تھے۔ کابینہ کے ارکان نے پہلے لوگر اور پھر گردیز میں اجلاس کیا کہ اب آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ میں نے اصرار کیا کہ ہم کابل سے پسپائی اختیار نہیں کریں گے بلکہ مرتے دم تک مقابلہ کریں گے۔ اگر ہم کابل سے حکمت عملی کے تحت چلے بھی جائیں تو چار اسیاب میں مجاہدین کی فرنٹ لائن برقرار رکھیں گے تا کہ ہم دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن کچھ دوستوں کی رائے تھی کہ مزاحمت نہیں ہو سکتی، بہتر یہ ہے کہ پہاڑوں کا رُخ اختیار کریں۔ کافی بحث کے بعد بھی مَیں نے ان کی بات نہیں مانی اور ان سے پوچھا کہ یہ آپ لوگوں کی رائے ہے یا امیر المومنینؒ کا فرمان ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ ہماری رائے ہے۔ مَیں نے جواب دیا کہ اس وقت تک مَیں آپ کی بات کو قبول نہیں کروں گا جب تک کہ امیر المومنین کا حکم نہ آ جائے۔ معاملہ امیر المومنینؒ کے حوالے کر دیا گیا اور فیصلہ ہوا کہ امیر المومنین سہ پہر کے وقت مرکزی وائرلیس میں آ کر سب کو حتمی حکم دیں گے، تمام عہدیداروں کو تیار رہنا چاہیے۔

اس وقت مَیں نے سوچا کہ مَیں نے امیر المومنین کے ساتھ ان کی شجاعت کی وجہ سے بیعت کی ہے، لہٰذا آج ان کا امتحان ہے کہ وہ غیرت کا مظاہرہ کریں گے یا پسپائی اختیار کریں گے۔

---

[۱] طالبان کے ماہنامہ ''شریعت'' کے مئی اور جون ۲۰۲۱ء کے شماروں سے استفادہ پر مبنی

سب ہی انتظار کر رہے تھے کہ امیر المومنین بڑے وائرلیس میں حتمی حکم دیں گے۔ جب امیر المومنین مرکزی وائرلیس پر آئے تو حمد وثناء کے بعد انہوں نے سب کو آخری دم تک لڑنے کا حکم دیا اور کہا کہ کوئی بھی ہتھیار نہ پھینکے، سب جہاد کا فریضہ انجام دیں، یہ سب سے اہم فریضہ ہے۔"

والد صاحب اس پر مسکرائے اور پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پھر میں نے اپنے ساتھ تجدید عہد کیا کہ امیر المومنین میرے قائد تھے، قائد ہیں اور قائد رہیں گے۔ مجھے آپ کی شجاعت پر ہمیشہ فخر رہے گا۔

عظمت واستقامت کا کوہِ گراں

گزشتہ دور امارت کے ابتدائی دنوں میں خوست کے گورنر رہنے والے عبدالباقی حقانی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ ہر دور کے متکبر اور جابر کا غرور اور جبر جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس تکبر اور ظلم کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اس وقت کے کسی پاک اور ایماندار مسلمان کا انتخاب کرتا ہے اور جو بظاہر مدمقابل کی نسبت بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ کامیابی کا دارومدار ظاہری وسائل پر نہیں بلکہ روحانی طاقت پر ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ سب سے زیادہ روحانی طاقت ہوتی ہے وہ اپنے وقت کے ظالم اور جابر کا تکبر خاک میں ملا سکتا ہے اور اس کا ظلم ختم کر سکتا ہے۔

آج دنیا میں امریکہ کا ناجائز تسلط اور تکبر عروج پر پہنچ گیا ہے۔ اسلامی اور غیر اسلامی دنیا اس کی سازشوں سے بری طرح متاثر ہے۔ دنیا کی سطح پر اس کا کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق اپنے وقت کے عزم، ہمت، اخلاص، اللہ پر بھروسہ رکھنے والا طالب علم امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد نوراللہ مرقدہ کو اس کام کے لیے چنا۔ اگر ان کے درمیان موازنہ کریں تو ظاہری وسائل کے لحاظ سے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے پاس ساز وسامان کی کوئی کمی نہیں تھی اور مدمقابل فریق کے پاس اطمینان بخش رات گزارنے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔

تاہم وہ عظیم روحانی ہتھیار سے لیس تھے۔ اگرچہ بظاہر اس درویش رہنما کا لشکر دنیا کے وسائل کے لحاظ سے کمزور تھا لیکن ایمان اور اخلاص کی دولت سے مالا مال تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا﴾ [فاطر ۳۵: ۴۳] اللہ تعالیٰ کے

طریقہ کار میں کبھی کوئی تغیر نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی سنت کو اس طرح بیان کرتا ہے: ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾[البقرہ۲:۲۴۹] کئی بار بڑی جماعت پر چھوٹی جماعت اللہ کے حکم سے غالب ہوئی ہے اور یہی بات دنیا نے دیکھی ہے کہ امریکی اور اس کے اتحادیوں کے پاس کتنے وسائل تھے اور اس کے مقابلے میں امیر المومنینؒ کی قیادت میں مجاہدین کے پاس کتنے وسائل تھے؟ نتیجہ بھی سب نے دیکھا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان میں ناکام ہو گئے جب کہ وہ درویش صفت رہنما ملا محمد عمرؒ اور اس کے مجاہدین کامیاب ہو گئے۔

جب مَیں خوست کا گورنر تھا۔ خوست کے اندر اور باہر مخالفین پروگرام کر رہے تھے جس سے ہمارے لیے مسائل پیدا ہو گئے، مَیں مشورہ کے لیے مرحوم امیر المومنین کے پاس گیا اور خوست میں بڑھتی ہوئی مشکلات سے انہیں آگاہ کیا۔ انہوں نے نہایت مختصر مگر پُرمغز جملہ کہا "اپنی پوری کوشش کرو۔ ہم اپنی سی کوشش کرنے کے مکلف ہیں۔ نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ دین بھی اللہ کا ہے اور مخلوق بھی اللہ کی ہے۔"

ان کی مختصر گفتگو سے مجھے بہت حوصلہ ملا کیونکہ ان مختصر الفاظ میں انہوں نے شریعت کے دو بنیادی اصولوں کی طرف مجھے متوجہ کیا۔ ایک یہ کہ انسان اپنی ساری طاقت کو باطل کے خلاف استعمال کرے تاکہ اس کی شرعی ذمہ داری پوری ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾[البقرہ۲:۲۸۶]۔ دوسرا یہ کہ انسان اپنے تمام معاملات اپنے حقیقی مالک کے سپرد کر دے۔ اس پر توکل کرے اور اس کی مدد کے وعدے پر بھروسہ کرے۔ قرآن حکیم میں ہے: ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾[غافر۴۰: ۴۴] ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ﴾ [الطلاق۶۵:۳]

ملا محمد عمرؒ نے روپوش رہ کر جہاد کو کیسے منظم کیا؟

امریکی جارحیت کا پہلا سال جارحیت پسندوں کے بے پناہ فوجی دباؤ اور ہمہ پہلو گھیرے کا دور تھا۔ امارت اسلامیہ کے مجاہدین نے اگرچہ اس سال تورابورا، شاہی کوٹ، بولدک کے ہوڑی پہاڑ اور زابل کی منتشر عسکری کارروائیوں کی صورت میں اپنی مزاحمت کے مظاہرے کیے تھے مگر یہ کارروائیاں امارت اسلامیہ کی پرانی تشکیلات کے تحت ہو رہی تھیں۔ نئے حالات کے مطابق نئی تشکیلات نہیں ہوئی تھیں۔

اس تاخیر کی ایک وجہ تو پہلے برس کی سختیاں، تکالیف اور اضطراری حالات تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ملا عبدالجبار عمری کے بقول امیر المومنین افغانستان پر امریکا اور ناٹو کی جارحیت کو اسلام اور کفر کی جنگ قرار دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ عام مسلمان اور اسلامی دنیا ایک شدید آزمائش کا شکار ہیں۔ انہیں توقع تھی کہ مسلم دنیا امریکی جارحیت کے خلاف غیر جانبدار نہیں رہ سکے گی، افغانستان کے مجاہد عوام کی حمایت ضرور کرے گی اور اسلامی سرزمین سے صلیبی تسلط کے خاتمے کے لیے اپنی کوششیں کرے گی۔

امریکی جارحیت کا ایک سال مکمل ہونے کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں جہادی مزاحمت بھی نئی سانسیں لے رہی تھی۔ امارت اسلامیہ کے کچھ اعلیٰ سطحی قائدین اور عوامی رہنماؤں کی جانب سے امیر المومنین کو مختلف ذرائع سے بار بار پیغام مل رہا تھا کہ موجودہ حالات کے مطابق جہاد کی قیادت کے لیے نئی تشکیلات کی جائیں۔ انہوں نے جہاد کی براہ راست قیادت کے لیے ملا عبیداللہ اخند اور ملا عبدالغنی برادر کو اپنا نائب مقرر کیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک صوتی پیغام ریکارڈ کر کے اس میں نئی شوری کی تشکیل کی جو گیارہ اراکین پر مشتمل تھی۔

اسی سال کے اواخر میں ۱۸ افراد کا اضافہ کر کے مرکزی رہبری شوری میں مزید توسیع کر دی۔ بعد میں امیر المومنینؒ نے وقتاً فوقتاً نئے اراکین کا اضافہ کیا۔ ان کی حیات کے آخری ایام تک رہبری شوری کے اراکین کی تعداد ۲۵ ہوگئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس وقت سیاسی دفتر کے سربراہ طیب آغا کی درخواست اور امیر المومنین کی منظوری سے سیاسی دفتر کے تین اراکین مولوی شیر عباس ستانکزئی، ملا عبدالسلام حنفی اور مولوی نیک محمد بھی رہبری شوری میں شامل ہو گئے۔

رہبری شوریٰ کی تشکیل کے فوراً بعد امیر المومنین نے ایک اور پیغام بھیج کر جہادی امور کی بہتر تنظیم سازی اور براہ راست قیادت کے لیے عسکری کمیشن تشکیل دیا۔ عسکری کمیشن کے دو ونگ تھے جو افغانستان کے مشرقی اور مغربی صوبوں کے زون میں تقسیم تھے۔

عسکری کمیشن کی تشکیل کے ساتھ سول امور کی انجام دہی کے لیے پہلے اقتصادی، میڈیا اور سیاسی کمیشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جو اپنے اپنے متعلقہ شعبوں میں کام کرنے لگے۔ اس کے بعد قضا اور عدالتوں کا ادارہ، صحت کمیشن، شہداء، تعلیم و تربیت کمیشن، اقتصادی کمیشن، قیدیوں کے امور کا کمیشن، معذوروں اور یتیموں کا سرپرست کمیشن، دعوت وارشاد کمیشن، رفاہی امور اور اداروں کا

کمیشن، عوامی نقصانات کی روک تھام کا ادارہ، اس کے علاوہ بھی کئی ادارے قائم کیے گئے۔ اس طرح امارت اسلامیہ ایک بار پھر ایک مکمل نظام کے طور پر سامنے آئی۔

چونکہ امیر المومنینؒ ایک خفیہ مقام پر رہائش پذیر تھے اور مجاہدین سے ان کا رابطہ صرف دو قاصدوں کے ذریعے ہوتا تھا اس لیے انہوں نے امور کی تیزی سے ادائیگی کے لیے رہبری شوریٰ کو وسیع اختیارات دے دیئے تھے۔

جائے رہائش کی تبدیلی

پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ امیر المومنینؒ نے خفیہ زندگی کے دور میں دو جگہ قیام فرمایا۔ پہلے گھر میں پانچ سال قیام کیا اور دوسرے گھر میں تقریبا سات سال گزارے۔ جس طرح افغانستان کے اندر رہنا ان کا اپنا فیصلہ اور بقول ان کے اپنی فہم اور تدبیر کے تقاضے پر عمل تھا، اپنے ٹھکانے کی تبدیلی بھی ان کا اپنا اور اچانک فیصلہ تھا۔

ان کے قاصد ملا عزیز اللہ اخند کا کہنا ہے کہ ایک دن اچانک جس گھر میں آپ کی رہائش تھی اس کے اہل خانہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا امیر المومنین کہتے ہیں کہ آج ہی نکل کر فوراً میرے پاس پہنچو۔ اس بات سے مَیں بہت حیران ہوا، سوچ رہا تھا کہ کوئی ایمرجنسی پیش آ گئی ہوگی۔ سفر کا آغاز کیا اور رات دیر سے ان کے پاس پہنچا۔

پہلے گھر کے سربراہ سے ملاقات اور گفتگو کی۔ ان سے پوچھا کہ کیا بات پیش آئی ہے کہ اتنا فوری بلا لیا ہے۔ انہوں نے کہا ہمیں بھی کچھ پتہ نہیں۔ ہمیں امیر المومنین نے بس اتنا ہی کہا ہے کہ ملا عزیز اللہ اخند کو بلاؤ۔ مَیں امیر المومنین سے ملنے گیا تو وہ بالکل ٹھیک تھے۔ اپنا دستی بیگ اور کلاشنکوف سامنے رکھ کر تیار بیٹھے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ میرا انتظار کر رہے تھے اور نکلنے کی تیاری میں تھے۔ میں نے مصافحہ کیا، مصافحہ کے بعد فوراً کہا چلو چلتے ہیں خیر سے۔ مَیں نے کہا کہ ''اللہ خیر کرے گا، ہم کہاں جا رہے ہیں؟ یہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟'' کہا نہیں مسئلہ کوئی نہیں، یہیں ضلع سیوری میں عمرزو کے گاؤں جائیں گے۔ مَیں نے کہا اب بہت رات ہو چکی ہے۔ جن کے پاس ہم جا رہے ہیں ان کو بھی کوئی اطلاع نہیں دی گئی ہے۔ مجھے راستے کا بھی صحیح علم نہیں۔ تاریکی بھی ہے اور راستہ بھی بہت طویل ہے۔

پھر میں نے کہا میں جا کر اہل خانہ کو یہ اطلاع دیتا ہوں۔ وہ دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے جا کر جب انہیں بتایا کہ امیر المومنین آپ کے گھر سے جانا چاہتے ہیں تو وہ بہت رنجیدہ ہو گئے۔ پوچھنے لگے کہ کیا ہمارے کسی فعل سے ناراض ہو گئے ہیں یا کوئی مسئلہ پیش آ گیا ہے؟ میں نے کہا نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ناراض نہیں ہیں بس وہ رہائش کا مقام بدلنا چاہتے ہیں۔ میزبانوں نے کہا کہ چلو پھر ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں اور آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔ امیر المومنین نے کہا: نہیں آپ لوگ تکلیف نہ کریں، ہم راستہ ڈھونڈ لیں گے، ان شاء اللہ۔

پھر ہم نے اپنا بیگ (جس میں ان کی ضرورت کا سامان تھا) اور اسلحہ اٹھایا اور چل پڑے۔ یہ ۲۰۰۵ء کا سال تھا۔ ایک طرف اندھیرا تھا اور دوسری طرف میں راستے سے واقف نہیں تھا، راستہ بھی بہت طویل تھا۔ راستے میں ایک امریکی اڈہ بھی پڑتا تھا۔ حکومتی صوبائی سیکریٹریٹ اور حفاظتی چوکیاں بھی تھیں۔ ہماری کوشش تھی کہ راستے سے ہٹ کر اندھیرے میں چلیں مگر امریکی کیمپ کی لائٹیں اتنی تیز تھیں کہ ہم جتنی بھی کوشش کرتے اس کی زد میں آنے سے بچ نہیں سکتے تھے۔ راستے سے زیادہ دور ہٹ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ راستے سے ناواقفیت کے باعث کہیں بھٹک جانے کا خدشہ بھی تھا اور آس پاس کھائیاں اور جھاڑیاں بھی زیادہ تھیں۔ امیر المومنینؒ کو چلتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ وہ پانچ سال مسلسل ایک جگہ رہے تھے، پیدل نہیں چلے تھے۔ اس رات ہم کل ملا کر پانچ گھنٹے چلے ہوں گے۔ پیدل سفر کے دوران ایک مرتبہ وہ اتنے تھک گئے کہ چلنا ناممکن ہو گیا مگر اس کے باوجود وہ چلتے رہے۔ میں نے کہا میں آپ کو کندھوں پر اٹھا کر چلتا ہوں۔ مگر ان کا دل نہیں چاہا، وہ بہرحال چلتے رہے۔ آخر جب بالکل ہی تھک گئے تو میں نے انہیں کندھوں پر اٹھایا۔ پھر ایسا ہوا کہ میں پہلے ان کا بیگ اور اسلحہ ساتھ لے کر کچھ آگے تک لے جاتا، پھر آ کر ان کے ساتھ چلنے میں مدد کرتا۔ کچھ دیر ہم اسی طرح چلتے رہے، پھر ان کی طبیعت جب کچھ ٹھیک ہو گئی تو وہ خود چلنے لگے۔

گاؤں پہنچ کر اس گھر کے پاس پہنچے جہاں امیر المومنین کو قیام کرنا تھا۔ وہیں ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گئے۔ یہ مرحوم شیر علی اکا کا گھر تھا۔ یہ وہی گھر تھا جہاں قندھار سے آنے کے بعد امیر المومنین نے پہلی بار زابل کے مقامی مجاہدین سے ملاقات اور اجلاس کیا تھا۔ اور پہلی راتیں بھی یہیں گزاری تھیں۔ میں نے ان سے کہا میں پہلے جا کر معلوم کرتا ہوں کہ گھر میں کوئی

مہمان تو نہیں۔ اور مہمان خانے کا دروازہ کھولتا ہوں کیونکہ دروازے پر دستک دینے سے آس پاس کے گھروں کے لوگ جاگ جاتے۔ شیر علی اکا کے مہمان خانے کا دروازہ گھر کی چار دیواری کے دروازے سے الگ تھا۔ مہمان خانے کی چار دیواری سے پھر ان کے گھر کی جانب راستہ کھلتا تھا۔ میں دروازے کے پاس گیا تو اللہ کے فضل سے یہ دروازہ آسانی سے کھل گیا۔ مہمان خانہ بھی خالی تھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے آ کر انہیں بتایا۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ میں نے امیر المومنین کو مہمان خانے کے اندر بٹھایا اور خود جا کر اہل خانہ کو اطلاع دے دی۔ گھر والے گھبرا گئے کہ ایسی تاریکی میں اتنی دیر اور ایسے اچانک کیسے آنا ہوا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟ امیر المومنین نے کہا: نہیں کوئی مسئلہ نہیں بے فکر رہو۔ پھر انہوں نے مرحوم شیر علی اکا سے کہا کہ مولوی عبدالجبار عمری کو اطلاع کر دو۔ عبدالجبار عمری آ گئے تو امیر المومنین نے ان سے مشاورت کے بعد فیصلہ کیا کہ اب یہیں قیام کریں گے۔ اس طرح بقیہ تمام زندگی انہوں نے اسی گھر میں بسر کی۔

دوسری جائے قیام

امیر المومنین کی یہ دوسری جائے قیام بھی اسی زابل ضلع سیوری کے گاؤں عمرزو میں ہے۔ اسی گھر میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سات سال پانچ ماہ گزارے۔ ان کی وفات کے کئی سال بعد زیر نظر کتاب کے لیے معلومات جمع کرنے کے لیے راقم خود اس گھر گیا۔ اہل خانہ نے امیر المومنینؒ کی طرز زندگی اور حیات کے متعلق معلومات فراہم کیں۔

یہ مٹی اور گارے کا بنا ہوا ایک پرانا کچا مکان ہے۔ علاقے کے دیگر غریبانہ گھروں کی طرح اس کی دیواریں بہت چھوٹی اور قدیم طرز پر بنے کمرے تھے۔ مہمان خانے کی چار دیواری کا دروازہ بہت پرانا تھا۔ یہاں جب امیر المومنینؒ کے قاصد آتے تو یہیں کھانا کھاتے، آرام کرتے اور گفتگو ہوتی۔ اس چار دیواری کے مغربی جانب ایک دروازہ کھلتا ہے، اندر ایک کمرہ ہے، جہاں احتیاط کے موقع پر چھپنے کی جگہ بھی بنائی گئی تھی۔ امیر المومنینؒ نے پہلے اسی کمرے میں قیام کیا اور دو سال یہاں رہے۔ بعد میں میزبانوں نے اسی چھوٹے سے صحن کے عقب میں ایک اور مکان بنایا جس کے شمالی جانب دو کمرے اور ان کے سامنے باغیچے کے لیے جگہ بنائی۔ ان دونوں کمروں میں سے ایک مشرقی جانب والا کمرہ امیر المومنین کے لیے ہی بنایا گیا تھا جس کے آگے ایک برآمدہ اور سردیوں میں دھوپ سینکنے کی جگہ تھی۔ ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا۔ اس کمرے میں اٹیچ باتھ روم اور

احتیاطی طور پر چھپنے کے لیے الگ جگہ بھی بنی تھی۔ ممکنہ خطرے کے موقع پر وہ وہیں چلے جاتے۔

میں اس گھر میں پہنچا تو دیکھا کہ ان کمروں کے آگے باغیچے میں درختوں کے چھوٹے نہال کھڑے تھے۔ انگور کی چھوٹی بیلیں، بادام کے نارسیدہ درخت اور گلاب کے پودے بھی تھے۔ سامنے امیر المومنین کے رہنے کی جگہ، ایک چھوٹا سا برآمدہ، اس برآمدے کے آگے ڈیڑھ میٹر طویل وعریض چھوٹا سا چمن تھا۔ برآمدے سے اندر کی جگہ دروازہ کھلا ہے۔ یہ امیر المومنین کا رہائشی کمرہ ہے۔ تین بائی تین میٹر کا کچا کمرہ جسے سفید کلر کردیا گیا تھا۔ کمرے میں قبلے کی جانب ایک لکڑی کی چارپائی ہے۔ یہ امیر المومنین کے بیٹھنے کی خاص جگہ تھی۔ یہاں بیٹھ کر دیوار سے تکیہ لگانے کی وجہ سے دیوار پر سر اور کندھوں کے نشان اب بھی تھے۔ چارپائی کے پاس بہت سی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں جن کا وہ مطالعہ کرتے تھے۔

کمرے میں ایک چھوٹا سا اٹیچ واش روم بھی تھا۔ اس کے ساتھ ایک طرف دیوار میں ایک الماری بھی تھی جسے زرد رنگ دیا گیا تھا۔ یہ الماری دراصل امیر المومنین کی دشمنوں سے بچنے کا ظاہری ذریعہ تھی۔ یہ الماری دراصل کھڑکی یا ایک دروازہ ہے، اسے پیچھے دھکیل دیا جائے تو یہ کھل جاتا ہے۔ دیوار کے پہلو میں بنی خفیہ جگہ کی جانب جانے کا راستہ یہی ہے۔ جب تلاشی ہونے لگتی تو وہ اسی الماری کی کھڑکی سے اس خفیہ جگہ میں چلے جاتے اور کسی کو شک بھی نہ ہوتا کہ یہاں کوئی اور جگہ بھی ہوگی۔

مخصوص قاصدوں کے توسط سے امارت اسلامیہ کا نظام سنبھالنا

امیر المومنینؒ نے اسی خفیہ مقام سے امارت اسلامیہ کے انتظامی معاملات اپنے مخصوص قاصدوں کے ذریعے سنبھالے۔ یہ دو قاصد ابتداء میں ملا عزیز اللہ اخند اور ملا عبدالباری اخند تھے۔ مگر بعد میں معاملات ایک ہی چینل سے سنبھالنے اور انہیں مزید منظم کرنے کے لیے صرف مولوی عزیز اللہ ہی کو قاصد متعین کیا گیا۔ جہاد کے ابتدائی سالوں میں جب جہادی سرگرمیاں کم تھیں تو قاصد کا آنا جانا بھی کم ہوتا تھا۔ کئی مہینوں میں ایک بار اس کی آمد ہوتی تھی۔ بعد میں جب امارت اسلامیہ کی تشکیلات وسیع اور سرگرمیوں میں تیزی آئی تو نمائندے کی آمدورفت بھی بڑھ گئی۔ مگر پھر بھی قاصد کی آمدورفت کا کوئی مخصوص دن یا کوئی مخصوص تاریخ متعین نہیں تھی۔ کبھی ایک مہینے میں کئی بار قاصد آتا اور کبھی ایک مہینے سے زیادہ تاخیر بھی ہوجاتی۔

امیر المومنین نے جہادی امور کے اکثر اختیارات رہبری شوری اور اپنے نائبین کے حوالے

کردیے تھے۔اس لیے بہت سے معاملات میں ان سے براہ راست مشاورت کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔مگراس کے باوجود امیر المومنینؒ جہاد کے تمام عسکری اور سول معاملات سے خود کو آگاہ رکھتے اور ہر شعبہ سے متعلق اپنی رائے متعلقہ اداروں اور ذمہ داران تک پہنچاتے۔امیر المومنینؒ سے مشاورت اکثر ان امور میں طلب کی جاتی جن پر رہبری شوریٰ میں اتفاق رائے مشکل ہوجاتا یا کوئی اختلافی موضوع اور بڑی سطح پر کوئی شکایت ہوتی یا داخلہ وخارجہ پالیسی کے متعلق کوئی اہم اقدام ہوتا۔

امیر المومنین کے قاصد کا کہنا ہے کہ وہ فدائی حملوں کے متعلق بہت احتیاط اور تحقیق کی تاکید کرتے کہ یہ حملے دشمن کے انتہائی اہم ترین مراکز پر ہونے چاہئیں اور پوری طرح تحقیق اور معلومات کے بعد ہونے چاہئیں۔امریکا کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ یہ زیادہ طویل عرصہ جنگ نہیں لڑ سکتے۔یہ بہت جلد جنگی علاقے چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں گے اور اختیارات مقامی فوجیوں کے حوالے کریں گے۔امریکی فوج کی پسپائی اور عقب نشینی کے بعد ان کا کہنا تھا کہ داخلی فورسز پر حملے اس طرح ہونے چاہئیں جس سے ان کے حوصلے پست ہوں اور وہ مرعوب ہوجائیں۔انہیں منظم ہونے کا موقع نہ ملے۔داخلی فوجیوں پر کمزور گوریلا حملے ہوں تو اس سے ان کے حوصلے بلند ہوں گے اور مزاحمت کی ہمت بڑھے گی۔ان کے یہ پیغامات جب ان کے نمائندوں کی توسط سے امارت اسلامیہ کے نائبین تک پہنچتے تو وہ بہت باریک بینی سے اس کا جائزہ لیتے،انہیں محفوظ کرتے اور عسکری ذمہ داران تک پہنچاتے۔

چونکہ امارت اسلامیہ کے تمام مجاہدین دینی جذبے اور عقیدے کی بنیاد پر جہاد کے لیے نکلے تھے اور اطاعت کا جذبہ ان میں موجود تھا،اس لیے امیر المومنینؒ اگرچہ جسمانی طور پر موجود نہیں تھے مگر امارت کے نظام پر ان کا پورا کنٹرول تھا۔اور یہ وسیع جہادی صف ایک چھوٹے سے گروپ کی طرح ان کی گرفت میں تھی۔کبھی نہیں دیکھا گیا کہ امارت اسلامیہ کے کسی فرد یا گروپ نے امیر المومنین کے کسی حکم سے سرتابی کی ہو۔امیر المومنین کا ہر فرمان ان کے لیے حرفِ آخر تھا جسے ہر مجاہد پورے شوق اور اخلاص سے بجالاتا۔

نئے جہادی مرحلے میں امارت اسلامیہ کی انتظامی تشکیل

ملا محمد عمرؒ کے فرامین اور ہدایات کے مطابق جہاد کے آغاز سے امارت اسلامیہ کی نئی تشکیل کا کام شروع ہوگیا اور مسلسل پھیلنے لگا۔امریکا کے خلاف جہاد کے مرحلے میں امارت اسلامیہ کی

انتظامی تشکیل کو دیکھا جائے تو اس کی موجودہ حالت درج ذیل بنتی ہے:

امیر المومنین نائب۔اوّل، نائب دوم، نائب سوم۔مرکزی رہبری شوریٰ

۱۔اعلیٰ عدلیہ کا ادارہ ۲۔دارالافتاء، فقہی مجالس وتخصصات کمیشن ۳۔کمیشن برائے عسکری امور ۴۔سیاسی دفتر ۵۔انٹیلی جنس کمیشن ۶۔تعلیم وتربیت وہائی ایجوکیشن کمیشن ۷۔کمیشن برائے مالی واقتصادی امور ۸۔دعوت وارشاد، جلب وجذب کمیشن ۹۔کمیشن برائے امور صحت ۱۰۔کمیشن برائے میڈیا وثقافتی وطباعتی امور ۱۱۔ زراعت، حیوانات، عشر وزکوٰۃ کمیشن ۱۲۔قیدیوں کے امور کی تنظیم ورہائی کمیشن ۱۳۔ رفاہی اداروں اور کمپنیوں کا کنٹرولر کمیشن ۱۴۔کمیشن برائے سرحدی امور ۱۵۔کمیشن برائے معدنیات وصنائع ۱۶۔عوامی نقصانات کی روک تھام وسمع شکایات کمیشن ۱۷۔بے سہارا، یتیموں اور معذوروں کے امور کا کمیشن ۱۸۔عسکری ٹیکنیکل وانجینئرنگ ادارہ ۱۹۔مرکزی ادارہ مالیات ۲۰۔دینی اشاعت کی نگرانی کا ادارہ ۲۱۔فدائی حملوں اور معسکرات کا ادارہ۔

سیاسی امور کی قیادت اور قطر دفتر

امیر المومنینؒ کے حکم پر سیاسی کمیشن کا آغاز امریکا کے خلاف جہاد کے آغاز کے ساتھ ہی ہوگیا تھا جن کے سربراہان کا تعین اور اس میں تبدیلی ہوتی رہی۔آخری دنوں میں امیر المومنینؒ نے اپنے دفتر کے سابق کارکن سید طیب آغا کو سیاسی کمیشن کے سربراہ کے طور پر مقرر کیا جو امیر المومنینؒ کی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔

سیاسی کمیشن جو امارت اسلامیہ کی خارجہ پالیسی کی تشکیل کرنے والا اہم ترین ادارہ تھا، امیر المومنینؒ نے انہیں جو اختیارات سونپے تھے اور مخصوص ذمہ داریاں ان کے حوالہ کی تھیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ امریکا اور دیگر بیرونی ممالک، سیاسی جماعتوں اور شخصیات سے ملاقاتیں اور مثبت روابط کا فروغ۔

۲۔ بیرونی ممالک خصوصاً امریکا کے ہاتھ میں قید افغانوں کی رہائی کے لیے مذاکرات، تبادلے یا کسی اور طریقے سے قیدیوں کی رہائی کی کوششیں۔

۳۔ اقوام متحدہ اور اس کے متعلقہ اداروں سے رابطہ اور افہام و تفہیم۔

۴۔ افغانستان کی غیر سرکاری شخصیات اور سیاسی جماعتوں سے رابطے اور ملاقاتیں۔

۵۔ بیرونی رفاہی اداروں سے ملاقاتیں اور مذاکرات۔

۶۔ افغانستان کے حوالے سے منعقدہ عالمی کانفرنسوں میں شرکت اور امارت اسلامیہ کا مؤقف عالمی دنیا تک پہنچانا۔

سیاسی کمیشن کو امیر المومنینؒ نے خارجہ پالیسی کی تشکیل اور مثبت تعلقات کے فروغ کے حوالے سے وسیع اختیارات دے رکھے تھے۔ ان کے نمائندے کے مطابق یہ وہ واحد کمیشن تھا جس کے معاملات امیر المومنین خود دیکھتے اور براہ راست ہدایات کے ذریعے رہنمائی کرتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے مرکزی رہبری شوری کو بھی ہدایت کی تھی کہ سیاسی کمیشن کو جو بھی ہدایت کی جائے پہلے وہ میرے علم میں لائی جائے اور اس پر میری رائے لی جائے۔ نمائندے کے بقول انہیں طیب آغا پر بہت اعتماد تھا اور ان کے اقدامات پر مطمئن تھے۔ اسی لیے ان سے اپنے نمائندے کے ذریعے براہ راست رابطہ قائم رکھتے اور کام کی توسیع اور تازہ ترین صورتِ حال کے حوالے سے رپورٹ طلب کرتے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ امیر المومنین ہمیشہ سیاسی مسائل میں شوریٰ کے فیصلوں اور رائے پر بھی عمل کرتے اور انہیں اپنی ہدایات میں شامل رکھتے۔

سیاسی کمیشن کے ذریعے امیر المومنین کا ایک اہم اقدام امریکا سے مذاکرات کا آغاز اور بیرون ملک سیاسی دفتر کھولنا تھا۔ دفتر کے آغاز کے متعلق سید طیب آغا کا کہنا ہے کہ ۲۰۰۹ء میں جرمنی سے سیاسی دفتر کے حوالے سے ملاقاتوں کا آغاز ہوا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ امارت اسلامیہ پہلے کابل انتظامیہ سے مذاکرات کرے۔ اس حوالے سے ہماری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ بالآخر ہمارا ان سے کابل انتظامیہ کی بجائے امریکا سے مذاکرات پر اتفاق رائے ہوگیا۔ یہ اتفاق رائے امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہدؒ کی منظوری ہی سے ہوا تھا اور اس کے لیے قطر کا انتخاب ہوا۔ بالآخر امریکا سے ہماری پہلی ملاقات ۲۰۱۰ء میں ہوئی۔ اس وقت ہم نے مذاکرات کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا تھا۔

پہلا مرحلہ اعتماد سازی کا تھا کیوں کہ اعتماد نہ ہونا بہت دوریوں کا باعث تھا۔ اعتماد سازی

کے مرحلے میں تین چیزیں شامل تھیں:

۱۔ گوانتاناموکے قیدیوں کا تبادلہ، جو بعد میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔

۲۔ بلیک لسٹ: ہمارا مطالبہ تھا کہ بلیک لسٹ کا مکمل خاتمہ کیا جائے جبکہ مقابل فریق کا کہنا تھا کہ یہ تدریجا کیا جائے گا۔ مذاکرات میں تسلسل آتا تو یہ بھی ہو جاتا۔

۳۔ سیاسی دفتر کا آغاز۔

مذاکرات کا دوسرا مرحلہ وہ تھا جس میں بیرونی افواج کے انخلا سمیت دیگر اہم موضوعات شامل تھے۔

امیر المومنین کے نمائندہ خاص ملا عزیز اللہ اخند کا کہنا ہے کہ سیاسی دفتر کے آغاز اور اس کے لیے جگہ کے انتخاب کے لیے امیر المومنینؒ نے تین شرائط پیش کی تھیں:

الف: سیاسی دفتر ایسے ملک میں کھولا جائے جو ہمارا پڑوسی نہ ہو۔

ب: ایسا اسلامی ملک ہو جس کی فوج افغان جنگ شامل نہیں۔ (امریکا کے اتحادی افواج میں شامل نہ ہو۔)

ج: ایسا ملک ہو جس نے خود بھی کبھی امارت اسلامیہ سے دشمنی والا رویہ اور سلوک روا نہ رکھا ہو۔

انہی شرائط کے تناظر میں امارت اسلامیہ کا سیاسی دفتر کھولا گیا۔ قطر میں طالبان کا ظہور اس لیے اہمیت کا حامل تھا کہ امریکی جارحیت کے بعد ایک عشرے تک امارت اسلامیہ اپنی سیاسی سرگرمیاں خفیہ طور پر سرانجام دیتی رہی تھی۔ مگر قطر میں دفتر کے افتتاح کے بعد ایک بار پھر انہیں موقع ملا کہ ایک ہم پلہ سیاسی فریق کی حیثیت سے اپنی موجودگی ثابت کرے۔ اس طرح عالمی کانفرنسوں میں سیاسی دفتر کے نمائندوں کی شرکت، وہاں امارت اسلامیہ کے مؤقف کی وضاحت اور مختلف حکومتوں اور جماعتوں سے مثبت افہام وتفہیم کے لیے ملاقاتیں شروع ہوگئیں۔

قطر دفتر کے فعال کردار نے امارت اسلامیہ کے حوالے سے وہ تصور دنیا کے بہت سے ممالک اور عوام کے ذہنوں سے صاف کر دیا جو امریکی پروپیگنڈے کے باعث بنا تھا۔ وہ یہ کہ امارت اسلامیہ ایک باغی اور بقول ان کے دہشت گرد گروہ ہے۔ طالبان کے سیاسی ظہور نے یہ

ثابت کردیا کہ امارت اسلامیہ افغان عوام کی خودمختاری اور استقلال کی حقیقی جنگ لڑ رہی ہے۔ جن کے پاس ایک بجا اور مدلل مؤقف اور پالیسی ہے۔ سیاسی دفتر کا ایک اور کارنامہ گوانتانا موکی جیل سے امارت اسلامیہ کے پانچ مجاہدین رہنماؤں حاجی ملا محمد فاضل مظلوم، ملا نوراللہ، ملا خیراللہ خیر خواہ، ملا عبدالحق وثیق اور مولوی محمد نبی عمری کی رہائی تھی، جو ایک امریکی فوجی باو بریگڈال کے بدلے میں ہوئی۔

خاندان کی سرپرستی

پہلے ذکر ہو چکا کہ امریکی جارحیت کی پہلی رات امیر المومنینؒ اپنے خاندان سے الگ ہو گئے اور پھر وفات تک اپنے اہل وعیال سے نہ مل سکے۔ اس دورانیے میں امیر المومنینؒ کے خاندان کی کفالت ملا عبدالمنان عمری کرتے رہے۔ ملا عبدالمنان اخند امیر المومنین کے ماں شریک بھائیوں میں سے زندہ بچ جانے والے ایک بھائی تھے۔ ان کے دو ماں شریک بھائی امارت اسلامیہ کے دورِحکومت میں شہید ہو گئے۔ ملا عبدالمنان اخند امارت اسلامیہ کی تحریک کے آغاز سے ہی ان کی گھریلو ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ امارت اسلامیہ کے آغاز کے ساتھ امیر المومنین کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ ابتدائی سالوں میں ایک ہفتے بعد ایک دن انہیں گھر جانے کے لیے وقت ملتا۔ ان کا زیادہ وقت امارت کے کاموں میں ہی گزرتا اس لیے گھر کی ذمہ داریاں انہوں نے ملا عبدالمنان کے حوالے کی تھیں۔ امریکی جارحیت کے بعد جب امیر المومنین اپنے خاندان سے الگ ہو گئے تو ملا عبدالمنان کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ مگر انہوں نے اس مرحلے پر بھی تمام خطرات اور مشکلات کے باوجود پوری ہمت اور اخلاص سے امیر المومنین کے خاندان کی کفالت کی۔ امیر المومنین کے صاحب زادوں نے تعلیم مکمل کی اور اس مشکل مرحلے سے کامیابی سے نکل گئے۔

ملا عبدالمنان اخند کہتے ہیں کہ اس دورانیے میں امیر المومنین نے صرف ایک مرتبہ وہ بھی ان کے قندھار چھوڑنے کے تقریباً دو ماہ بعد سٹیلائٹ فون پر مجھ سے اور اپنے بڑے بیٹے مولوی یعقوب صاحب سے بات کی تھی، اور اپنے خاندان کا حال احوال پوچھا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی ان کی اپنے خاندان سے ٹیلیفونک گفتگو نہیں ہوئی، نہ کبھی اپنے خاندان سے ملے۔ البتہ قاصدوں کے واسطے سے ہمیشہ اپنی ہدایت اپنے خاندان تک پہنچاتے اور ان کے حالات سے خود کو باخبر رکھتے۔

امیر المومنین کے صاحبزادے مولوی محمد یعقوب صاحب کہتے ہیں کہ امیر المومنین وقتاً فوقتاً ہمارے خاندانی مسائل کے حوالے سے ہمیں ہدایات بھیجتے، ہم خاندان کے بڑے اور اہم معاملات کے ساتھ ساتھ چھوٹے واقعات اور عام سے معاملات میں بھی ان سے مشاورت طلب کرتے اور ان کی ہدایات لیتے۔

زابل میں رہائش کے دوران ان کی دوسری جائے رہائش پہلے جگہوں کی بہ نسبت وسیع اور اس قابل تھی کہ ان کے ساتھ ان کا خاندان اور بچے رہائش پذیر ہوسکیں۔ ملا عبدالجبار عمری کہتے ہیں کہ ہم نے کئی بار امیر المومنین کو پیش کش کی کہ ہم ان کے اہل وعیال اور بچوں کو لے کر یہاں آجائیں گے۔ مگر ان کا جواب یہ تھا کہ پہلے تو سیکورٹی حالات مناسب نہیں ہیں۔ پھر اس وقت اللہ تعالیٰ نے میرے لیے گوشہ نشینی اور تنہائی بہت محبوب کردی ہے۔ اس تنہائی میں عبادت کا جو مزہ اور روحانی کیفیات دیکھی ہیں وہ مَیں ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اس دورانیے میں امیر المومنین کی صحت کی حالت

عبدالجبار عمری کہتے ہیں کہ روپوشی کے ایام کے آخر میں امیر المومنین کا جسم تدریجاً کمزور ہونے لگا اور وزن کم ہونے لگا۔ چہرہ زرد اور سینے کی تکلیف کی شکایت بڑھنے لگی۔ یہ سب علامات ٹی بی کی بیماری کی تھیں۔ مگر ہم بروقت اس کا ادراک نہیں کر پائے کہ اس کا علاج کراتے۔ اس کے علاوہ عموماً ان کی صحت درست رہتی۔ کبھی کبھی موسمی بیماریاں جیسے زکام وغیرہ لاحق ہو جاتیں مگر وہ دوائی کے بغیر ٹھیک ہو جاتیں۔ ان کی عادت یہ بن گئی تھی کہ بیماری میں صبر اور مزاحمت سے کام لیتے۔ بیماری کی شکایت بالکل نہ کرتے۔ اگر کبھی ساتھی سمجھ جاتے اور دوائی کا کہتے تو بھی ٹال دیتے اور کہتے کہ یہ عام سی بیماری ہے خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ کبھی کبھی دانتوں میں تکلیف ہو جاتی۔ اگرچہ جسمانی لحاظ سے کبھی کبھی بیماری اور تکلیف پیش آتی مگر اعصابی اعتبار سے بالکل مضبوط اور صحت مند تھے۔ مصائب اور تنہائی کا بلند عزم سے مقابلہ کرتے۔ ایسی کوئی علامت دیکھنے میں نہیں آئی جو ان کی اعصابی بیماری پر دلالت کرتی ہو۔

مرض وفات

امیر المومنینؒ کے میزبان بتاتے ہیں کہ وفات سے تین دن قبل ایک رات کو میں کھانا لے کر

ان کے کمرے میں گیا۔ کھانا رکھ کر میں واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب دوبارہ گیا تو آپ دیوار سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ میں نے آواز دی مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ میں نے انہیں پہلو پر لٹا دیا۔ اس مسئلے کے حل اور ان کے علاج کے لیے میں نے اپنے گاؤں کے ایک ہم راز پڑوسی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور امیر المومنین کی بیماری کی شدت کا بتایا۔ ان کے ساتھ مشورہ کے بعد طے ہوا کہ اس موجودہ گھر سے انہیں قریبی دوسرے گھر منتقل کیا جائے۔ ۲۳/اپریل ۲۰۱۳ء کا دن تھا، موسلا دھار بارش برس رہی تھی، پوری رات افغانستان کے جنوبی صوبوں میں شدید بارش اور ژالہ باری ہوتی رہی۔ اسی رات کو قندھار ائیر پورٹ پر شدید ژالہ باری کے باعث ناٹو اور امریکی فوج کے تقریباً ۵۰ ہیلی کاپٹر بھی وقتی طور پر قابل پرواز نہیں رہے تھے جس کی خبریں میڈیا پر بھی آئی تھیں۔ امیر المومنین اپنے دیگر تین ساتھیوں کے ساتھ اسی رات اپنی جائے رہائش سے ایک اور مکان میں منتقل ہو گئے۔

اگلے دن صبح ثور کی تیسری تاریخ (۲۴/اپریل) تھی۔ امیر المومنینؒ صبح کچھ ٹھیک تھے۔ چائے بھی پی اور کچھ گفتگو بھی کی۔ کچھ دیر بعد پھر ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ میزبان خاندان کے افراد اور جمع ہونے والے دیگر لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی حالت سے امارت اسلامیہ کی قیادت کو آگاہ کیا جانا چاہیے۔ اسی روز قائدین کو آگاہ کرنے کے لیے نمائندے بھیجے گئے۔ امیر المومنین پر اسی روز اور اگلے روز بھی کبھی بے ہوشی طاری ہو جاتی اور کبھی افاقہ ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ان کے سینے کی تکلیف بھی بڑھنے لگی۔

اس کے اگلے روز ایک ڈاکٹر ان کے پاس لایا گیا۔ اس نے چیک اپ کر کے بتایا کہ ان کی حالت نازک ہے۔ انہیں ہسپتال منتقل نہیں کیا گیا تو ان کی زندگی خطرے سے دوچار ہو سکتی ہے۔ فیصلہ اس بات پر ہوا کہ عصر کو انہیں ایک عام مریض شہری کی حیثیت سے خفیہ طور پر کلات یا اور کسی ہسپتال منتقل کر کے داخل کر دیا جائے گا۔ مگر سہ پہر کے آخری لمحات میں اللہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور اس فانی زندگی سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

افغانستان

حافظ محمد موسیٰ بھٹو[1]

ملا عمرؒ کی اسلامی تحریک - ہمارے لیے رول ماڈل

جدید اسلامی تحریکوں کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے

ملا عمر کی اسلامی تحریک نے اس دور میں جو کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ دنیا کی مادی اعتبار سے مستحکم مشترکہ طاقتور اور بڑی بڑی قوتوں کو خود ساختہ ہتھیاروں سے اپنی ایمانی قوت سے شکست دینا، یہ اس دور کی اسلامی دنیا کا سب سے بڑا اور انوکھا واقعہ ہے۔

امریکہ اور ان کی اتحادی قوتوں کو شکست دینے میں جہاں ان کے جہادی جذبہ، کارکنوں کا قیادت کے احکامات کے سامنے سرتسلیم خم کرنا اور اللہ کی ذات پر یقین کامل ہونا، غیروں سے مکمل طور پر صرف نظر کرنا، صرف اور صرف اللہ کی ذات سے اپنی امیدیں وابستہ کرنا، ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود اپنے مؤقف پر مستحکم رہنا، سادہ زندگی اور روکھی سوکھی کھا کر جہادی تحریک کو جاری رکھنا، اللہ کے دین کو ہر صورت میں غالب کرنے کے جنوں کا ہونا، اپنی جانوں سے بے پرواہ ہو کر سپر طاقت کا مقابلہ کرنا، پرانے ہتھیاروں اور جذبہ جہاد سے جدید طاقتور ترین ٹیکنالوجی کا مقابلہ کرنا، ابتدائی دور کے مسلمانوں کے سادہ طرز زندگی کو وظیفہ بنانا، جمہوریت اور جدید نوعیت کی پلاننگ جیسی چیزوں سے بے نیازی کا ہونا، درویشی اور درویشانہ طرزِ عمل کا ہونا، اسلام کے اس دور میں قابل عمل ہونے کے پختہ یقین کا ہونا، جدید دور کی اسلامی تحریکوں کی جمہوریت نوازی اور وسائل کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے کی روش سے بے نیازی کا ہونا، برسوں سے برسرِ پیکار ہونے کے باوجود مایوسی کا نہ ہونا، سلف صالحین کی سی ایمانی طاقت کا ہونا، لمبے چوڑے نظریاتی مباحث کا نہ ہونا، اللہ کے مقابلہ میں بڑی طاقتوں کو پرکاہ کی حیثیت نہ دینا، مسلمان ممالک کے دباؤ کو خاطر میں نہ لانا، جدید اسلامی تحریکوں کی طرح وسائل کے حصول کے لیے لمبے چوڑے منصوبوں سے صرف نظر کرنا، جہادی تحریک سے مالی مفادات وابستہ نہ کرنا، اپنے معیار زندگی کو پست سے پست تر رکھنا، اللہ کی ذات کے علاوہ دوسروں کی طرف مالی مدد کے لیے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے سے محفوظ ہونا۔

کسی بھی سطح پر جدیدیت سے مرعوبیت کا نہ ہونا، ایمانی فراست کا حامل ہونا، سلسلوں کے ذکر کو وظیفہ حیات کی حیثیت سے اختیار کرنا اور اس ذکر سے روزانہ نئی توانائی حاصل کرتے رہنا اور

[1] مدیر ماہنامہ 'بیداری' اردو و سندھی، مصنف کتب کثیرہ

ذکر سے حمیت دین اور جذبہ جہاد میں ذوق وشوق کے اضافہ کا ہونا، وغیرہ یہ وہ اصول، نقوش اور خطوط ہیں، جو طالبان کی اسلامی تحریک کا بنیادی حصہ رہے۔

اللہ کی طرف سے مخلصین کے لیے نصرت کے دروازوں کا کھلنا

جو بھی اسلامی تحریک ان اصولوں اور ان نکات کو پیش نظر رکھ کر، اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے کام کرے گی، اس کے ساتھ اللہ کی غیر معمولی مدد ونصرت شامل حال ہوگی اور اس کے لیے ایسے حالات پیدا کردیئے جائیں گے کہ دشمن کی ساری سازشیں، ساری تدابیر اور مکر وفریب کی ساری وارداتیں ناکامی سے دوچار ہوں گی۔

افغانستان میں ملا عمر کی تحریک کے علاوہ دوسری جہادی تحریکیں بھی موجود تھیں، جو سابق سویت یونین کے خلاف جہاد میں پیش پیش تھیں لیکن یہ تحریکیں اس لیے گمنامی کی نذر ہوکر بے اثر ہوگئیں کہ وہ مالی مدد کے لیے مالداروں پر یقین رکھتی تھیں اور اللہ کی مدد اور نصرت پر ان کا یقین متزلزل تھا۔ وسائل تو سارے کے سارے اللہ ہی کے ہیں، فتح اور کامیابی بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے، جو بھی تحریک اللہ کی ذات پر کامل یقین کے ساتھ سلف کے طرز پر جذبہ جہاد اور غلبہ دین کے لیے کام کرے گی، اللہ اس کے لیے یقیناً نصرت کے دروازے کھول دے گا۔

طالبان کو حاصل ہونے والی کامیابی کا جدید اسلامی تحریکوں کے لیے نیا پیام لانا

طالبان کو حاصل ہونے والی کامیابی دراصل دوسری اسلامی تحریکوں کے لیے یہ پیام لائی ہے کہ وہ جدیدیت کے اثرات سے آزاد ہوکر، طرز جمہوریت، اس کے لوازمات اور پروپیگنڈہ اور پبلسٹی وغیرہ سے بے نیاز ہوکر معاشرے کی اسلامی خطوط پر تربیت کے لیے یکسو ہوجائیں اور اس مقصد کے لیے پوری حکمت کے ساتھ آخری حد تک اپنی توانائیاں صرف کریں، اس کام کے لیے اخلاص، بے لوثی، ایثار، قربانی، مالی وسائل سے بے نیازی، بہتر حکمت عملی، مستقل مزاجی اور اللہ کی ذات پر یقین کامل کے ساتھ کام کریں تو یقیناً ایک وقت آئے گا جب ان کے لیے حالات کو اس طرح سازگار بنایا جائے گا کہ دشمن اور ان کی آلۂ کار قوتیں عاجز اور بے بس ہوجائیں گی۔ طالبان کی کامیابی نے اس بات کو دو اور دو چار کی طرح واضح کردیا ہے کہ اللہ کے سامنے جدید ٹیکنالوجی اور مادی قوت کی کوئی حیثیت نہیں۔

جدید اسلامی تحریکوں کو خود احتسابی کے ذریعہ سب سے پہلے اپنے نقائص اور کمزوریوں کو سمجھنا ہوگا اور ان کمزوریوں کو دور کرکے آگے بڑھنا ہوگا۔

جدید اسلامی تحریکوں کی کمزوریوں کی نشاندہی، جذبۂ محبت کے ساتھ

ہماری نظر میں جدید اسلامی تحریکوں کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان کے ہاں اخلاص، بے نفسی، للّٰہیت، تعلق مع اللہ، ایثار وقربانی، سیرت سازی اور کردار سازی کا فقدان ہے۔ جب تک شخصیت کی تعمیر میں استحکام نہ ہوگا، بے نفسی وللّٰہیت کا غلبہ نہ ہوگا، سادہ طرز زندگی کا رجحان غالب نہ ہوگا، نام ونمود اور اخباری بیانات اور تصاویر کے شغل سے بے نیازی نہ ہوگی، اس وقت تک غلبۂ دین کے کام میں حائل رکاوٹیں دور نہ ہوں گی۔

دوسری کمزوری یہ ہے کہ کاغذی منصوبہ بندی اور دفتری نوعیت کے کاموں پر زیادہ زور ہے۔ نیز نظری اور نظریاتی مباحث کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے جب کہ دعوتی کام، افراد سازی کا کام، معاشرہ کو اسلامی تحریک سے ہمنوا بنانے کا کام، کارکنوں میں حمیت دین پیدا کرنے کا کام اور انہیں متحرک کر کے معاشرے میں پھیلانے کے کام کو قابل ذکر اہمیت حاصل نہیں۔

جدید اسلامی تحریکوں کی تیسری کمزوری یہ ہے کہ دعوے تو بلند بانگ ہیں کہ ریاست کو اسلامی ریاست میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ بظاہر کارکنوں کے سامنے ہدف بھی یہی ہوتا ہے لیکن اللہ سے مستحکم تعلق کے اجتماعی نظام کے فقدان اور فکر میں اس کام کی غیر معمولی اہمیت نہ ہونے کی وجہ سے کارکنوں میں جو کمزوری پیدا ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ قیل وقال میں تو غازی ہوتے ہیں، لیکن عملی جدوجہد کے لیے جو ایمانی اور روحانی قوت چاہیے، وہ اس سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایمانی اور روحانی قوت کی کمی کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ اسلامی تحریک اخباری بیانات اور کاغذی منصوبوں میں تو آگے ہوتی ہے، لیکن معاشرہ پر اثر انداز ہونے کے معاملہ میں وہ پیچھے ہوتی ہے، جدید اسلامی تحریک کا کارکن فکری اور نظریاتی اعتبار سے تو مستحکم ہوتا ہے، وہ باطل کی قوت اور اس کے نظریات کو پوری طرح سمجھتا بھی ہے لیکن وہ داخلی اور باطنی طور پر کمزور ہوتا ہے، ذکر کے نور کی کمی اس کے لیے اپنے ساتھیوں سے محبت پیدا کرنے اور ان سے شفقت اور ایثار کا مظاہرہ کرنے کی راہ میں بھی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے، اس طرح اسلامی تحریک کاغذی طور پر تو مستحکم ہوتی ہے، لیکن معاشرہ میں وہ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے میں ناکامی سے دوچار ہوتی ہے۔

جدید اسلامی تحریک کی ایک کمی یہ ہے کہ وہ مالی وسائل کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ تگ ودو کرنے کے لیے کوشاں ہوتی ہے، حالانکہ قناعت اور سادگی سے کام کر کے وسائل کی خالق ہستی پر یقین کامل رکھنا چاہیے۔ وسائل کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے کی ادا ایسی

ہے جو اللہ کو پسند نہیں۔ایسی اسلامی تحریک کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہے۔

طالبان کی اسلامی تحریک ان سارے معاملات میں جدید اسلامی تحریکوں کے لیے ایک پیغام اور لائحہ عمل پیش کرتی ہے۔ کاش کہ ہمارے اندر وہ صلاحیت موجود ہوتی کہ ہم تحریک طالبان کے اس پیغام کو سمجھ کر، اس کے اختیار کردہ اصولوں کو اپنا سکیں۔

اسلامی تحریک کا پوری انسانیت کا سرمایہ ہونا

یہ بات واضح ہے کہ اسلامی تحریک کسی گروہ اور جماعت کا سرمایہ نہیں ہے بلکہ وہ پوری امت کا سرمایہ ہے، بلکہ وہ پوری انسانیت کا سرمایہ ہے۔اس لیے کہ اسلامی تحریک کی کامیابی سے غیر مسلم قوموں پر اسلام کی صداقت وحقانیت واضح ہوگی، ان تک توحید کے پیغام کی رسائی کی صورت پیدا ہوگی، اس طرح ان تک دین کے اتمام حجت کی صورت پیدا ہوگی اور ان کے لیے دنیا وآخرت میں اللہ کے عتاب سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوگی۔

اس لیے اسلامی تحریکوں کو امت اور انسانیت کے حوالے سے کردار کی نوعیت کو سمجھ کر، طالبان کی اسلامی تحریک کے پیام پر غور وفکر کرکے اپنی تحریک کے رُخ کو بدلنا چاہیے۔

مسلمان ممالک کا سیکولر طرز فکر اختیار کرنا اور اس سے ملنے والی سزا

دنیا میں پچاس سے زیادہ مسلمان ممالک موجود ہیں۔دنیا کے قدرتی وسائل کا کافی بڑا حصہ ان کے پاس ہے۔زیر زمین قدرتی وسائل، بہترین زرعی زمین، خام مال، اناج اور پھل، پانی کے ذخائر، سمندر کے ساحلی علاقے، محنت مزدوری کرنے والے افراد کی کثیر تعداد، ڈاکٹر، انجینئر، بہترین ٹیکنیکل صلاحیتوں کے ماہرین وغیرہ، ان ساری صلاحیتوں کے باوجود مسلمان ممالک معاشی اعتبار سے پست ہیں اور مغرب کے ذہنی غلام اور ان سے مرعوب ہیں، بلکہ صحیح معنی میں مسلمان ممالک کے مقتدر طبقات عام طور پر سیکولر فکر کے حامل ہیں، اور اسلام پر ان کا نظام زندگی کی حیثیت سے اعتماد ختم ہو چکا ہے۔اس کی سزا یہ ہے کہ مسلمان ممالک معاشی، سیاسی، معاشرتی، روحانی اور اخلاقی اعتبار سے زبوں حالی کا شکار ہیں۔وہ اپنے نظام کو چلانے کے لیے مغرب کی فکری لائن اور ان کی دی ہوئی معاشی لائن پر چلنے پر مجبور ہیں۔اکثر مسلم ممالک بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے قرضہ لے کر اپنا نظام چلا رہے ہیں، مسلمان ممالک کی جدید نسلیں فکری انتشار، ذہنی دباؤ، وجدانی بیماریوں اور روحانی واخلاقی خرابیوں کا شکار ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر:)

افغانستان مدیر

طالبانِ افغانستان کے لیے چیلنج

۱۔ طالبان افغانستان کے سامنے سب سے بڑا فکری (اور عملی) چیلنج، ہماری رائے میں، یہ ہے کہ وہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے ردّ وقبول کے حوالے سے کیا رویہ اختیار کرتے ہیں؟ اور عالم کفر اور مغرب سے مرعوب مسلم حکمرانوں اور علماء کا دباؤ کتنا قبول کرتے ہیں؟ ہم آئندہ شمارے میں اس پر تفصیل سے اظہار خیال کریں گے، ان شاء اللہ۔ تاہم یہ واضح رہے کہ ہمارے نزدیک یہ اتنی اہم بات ہے کہ اسی پر مستقبل میں طالبان کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے؛ کیونکہ اگر انہوں نے مغرب کا یا مغرب سے مرعوب مسلمان حکمرانوں اور علماء کا دباؤ قبول کرلیا تو معاف کیجیے ممکن ہے وہ کچھ دیر کے لیے اپنی حکومت بچالیں لیکن اسلامی انقلاب کا خواب بہر حال بکھر جائے گا اور چونکہ انہوں نے اس کے لیے ہزاروں جانوں کی قربانی دے کر حق کی گواہی دی ہے، اس لیے اس گواہی سے، خدانخواستہ، انحراف دنیا وآخرت دونوں میں ان کے لیے ناکامی اور اللہ کی ناراضی کا سبب بنے گا.... اگرچہ ہماری توقع یہی ہے کہ طالبان اس پر امن جہاد اور کشمکش میں بھی، ان شاء اللہ، کامیاب اور سرخرو ہوں گے۔

اور ہم انہیں یہی مشورہ دیں گے کہ وہ کسی سے دبیں اور نہ کسی سے مرعوب ہوں۔ خصوصاً وہ مغربی فکر وتہذیب کے اداروں (سیاسی نظام میں جمہوریت، معاشی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام، سودی بنکنگ، ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف سے قرض، معاشرتی نظام میں عورتوں کی بے پردگی وغیرہ) کو ہرگز قبول نہ کریں اور ڈٹ کر اسلامی تعلیمات پر عمل کریں۔ سیاسی میدان میں وہ صرف ان لوگوں کو ساتھ ملائیں جو اسلامی شریعت کے نفاذ کو قبول کریں اور اس کی مزاحمت نہ کریں۔ بلکہ ان معاملات میں وہ ان مسلم حکمرانوں اور متجدد علماء کی بات بھی نہ سنیں جو مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب سے مفاہمت اور تلفیق کی تلقین کرتے ہیں کہ مغربی جمہوریت اور اسلام کو ملا کر 'اسلامی جمہوریت' بنالی جائے اور مغربی بنکنگ اور اسلام کو ملا کر 'اسلامی بنکنگ' بنالی جائے۔ حالانکہ یہ طریق کار عملاً ناکام ہو چکا ہے اور اس کے نتیجے میں عالم اسلام میں مغربی فکر وتہذیب کے اصول واقدار غالب آگئے ہیں اور اسلامی اصول واقدار اور اسلامی قوتیں مغلوب ہوگئی ہیں۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا افغان طالبان کو ہمارے مشوروں کی ضرورت ہے؟ اور کیا ہمیں انہیں مشورے دینے چاہئیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سطور کی تحریر کے وقت (یعنی اگست ۲۰۲۱ء کے چوتھے ہفتے میں) افغانستان میں ہنگامی حالات ہیں، اضطراب، بے چینی اور افراتفری کی فضا ہے۔ امن وامان کی بحالی، حکومت سازی، داخلی قوتوں سے اختلافات اور جوڑتوڑ ،ملکیوں اور غیر ملکیوں کا انخلا جیسے اہم معاملات ہیں اور وقتی طور پر طالبان قیادت نہ اس وقت کوئی مشورہ سن سکتی ہے اور نہ انہیں ڈسٹرب کرنا چاہیے....لیکن اس کے باوجود، ہماری رائے یہ ہے کہ ہمیں اس موضوع پر سوچنا بھی چاہیے اور لکھنا بھی چاہیے، کیونکہ ہماری باتیں جلد یا بدیر ان تک پہنچیں گی اور وہ انہیں سنیں گے بھی، ان شاء اللہ۔ دوسرے یہ کہ اس کے لیے ہم پاکستانیوں کی ذہن سازی بھی ضروری ہے تاکہ عصر حاضر میں ایک اسلامی مملکت کے قیام، نفاذ شریعت اور مغربی فکر وتہذیب کے ردّ وقبول کے حوالے سے ان کا ذہن واضح ہو سکے۔

بقیہ: یادگارِ پاکستان حادثہ۔حکومت سارے پہلو سامنے رکھے

۳۔ لڑکیوں کی بے حرمتی اور ریپ کے جو واقعات ہو رہے ہیں، اس کا زیادہ تر ذمہ دار ہمارا میڈیا ہے جو ہماری دینی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کو تباہ کر رہا ہے۔ پہلے ان کی ترغیب دیتا ہے اور پھر چسکے لے لے کر اسے بار بار دکھاتا اور بیان کرتا ہے۔ اس کی وجہ مخلوط تعلیم بھی ہے۔ ان دونوں شعبوں کو کنٹرول کرنا حکومت کا کام ہے لیکن حکومت کو ان کی اصلاح کرنے اور انہیں بگاڑ سے بچانے کی کوئی فکر نہیں اور نہ وہ اس کے لیے کوئی اقدامات کرنے کو تیار ہے۔ پبلک پارکوں میں اگر غیر مہذب عناصر پائے جاتے ہیں تو ان کو کنٹرول کرنا بھی حکومت کا کام ہے۔

۴۔ دینی عناصر بھی معاشرے میں اخلاقی انحطاط کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے۔ دینی سیاسی لوگ صرف سیاسی جدوجہد میں مشغول ہیں۔ تبلیغی اصلاحی جماعتیں معاشرے وریاست کی اصلاح سے لاتعلق ہیں۔ دینی مدارس صرف علماء تیار کرتے ہیں اور جدید تعلیم کی مغرب زدگی اور اس کی اصلاح سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ مساجد مسلک پرستی اور فرقہ واریت کی گڑھ بن چکی ہیں۔

ان حالات میں عوام کی دینی اور اخلاقی اصلاح کون کرے گا؟ یہ بات سنجیدہ غور وفکر کی مستحق ہے۔

افغانستان

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

طالبان کی معاشی پالیسی کیا ہونی چاہیے؟

[یادش بخیر! جب ایم ایم اے نے صوبہ خیبر پی کے میں حکومت بنائی تو ہم نے لاہور میں صبح سے عشاء تک ایک طویل سیمینار رکھا جس میں ہر شعبہ کے اسلامی ماہرین کو بلایا تا کہ وہاں کی حکمران جماعتوں کو نفاذ شریعت کے لیے موزوں مشورے دیے جاسکیں۔جمعیت علماء اسلام کے حافظ حسین احمد اور جماعت اسلامی کے پروفیسر محمد ابراہیم صاحب نے اس اجلاس میں شرکت کی اور نوٹس لیے۔ہماری تجاویز پر کتنا عمل ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے۔ بہر حال اس وقت انقلابِ افغانستان ہمارے سامنے ہے اور ہماری خواہش ہے کہ 'الدین النصیحہ' کے فرمان نبوی کے مطابق ہم ان تک وہ باتیں پہنچائیں جن سے عصر حاضر میں ایک پائیدار اسلامی تبدیلی کی راہ ہموار ہوسکتی ہے اور ایک مضبوط اسلامی ریاست قائم ہوسکتی ہے۔اس ضمن میں ہم تازہ شمارے میں معاشی پہلو سے متعلق دو دانشوروں کی تحریریں شامل کر رہے ہیں اور دوسرے شعبہ ہائے حیات کے بارے میں بھی آئندہ شمارے میں تجاویز سامنے لائیں گے،ان شاءاللہ۔مدیر]

الحمدللہ کہ توقعات سے بہت قبل حضرت امیر المومنین ملا ہبیت اللہ کی ولولہ انگیز قیادت میں امارت اسلامیہ کا احیاء ہو گیا ہے۔ یہ واقعہ عالمی سرمایہ دارانہ سامراج کی ایک فیصلہ کن شکست ثابت ہوسکتا ہے۔

طالبان عالیشان کو غلبہ ایک ایسی معیشت پر ہوا ہے جو نہایت پسماندہ ہے اور جہاں غیر سرمایہ دارانہ معیشت کا قیام اور استحکام ایک دشوار گزار عمل ہے۔ امارت اسلامیہ کے پہلے دور (۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء) میں طالبان کی معاشی پالیسی غیر مربوط اور قدرے غیر منظم رہی تھی اور اس کمزوری سے سامراجی دشمن نے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اب طالبان اپنی معاشی پالیسی کو ہوشمندی اور حقیقت پسندی سے مرتب کریں۔

معاشی پالیسی کے مقاصد

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ طالبان آج اس پوزیشن میں نہیں کہ ایک مثالی (Ideal) اسلامی غیر سرمایہ دارانہ معیشت قائم کریں۔ وہ اس مثالی اسلامی معیشت کے قیام کی طرف ابتدائی قدم ہی اٹھا سکتے ہیں اور اس ضمن میں انہیں سرمایہ دارانہ انقلابات کے سابقہ تجربات

سے یقیناً فائدہ اٹھانا ہوگا لیکن انہیں اس بات کی بھی کوشش کرنا ہوگی کہ ان تجربات کو دہرانے کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ نظام کی طرف مراجعت نہ ہو جیسا کہ روس، چین، ویت نام اور کیوبا میں ہوا۔

اس نظاماتی تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ طالبان اوسط وقتی (medium term) معاشی مقاصد طے کریں مثلاً آئندہ تین یا پانچ سال کے لیے، اور ان مقاصد کے حصول کی رفتار کو جانچنے کے لیے سالانہ بجٹ سازی کی جائے۔ میری رائے میں آئندہ پانچ سال کے دورانیہ کے لیے حسب ذیل مقاصد کا تعین مناسب رہے گا:

۱۔ عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے انخلا اور قومی خود کفالت کا فروغ

۲۔ ایک جہادی معیشت کا قیام

۳۔ ایک قومی غیر سرمایہ دارانہ نظام زر کا قیام

۴۔ ریاستی اقتصادی وسائل کی توسیع

۵۔ علاقائی معاشی تعاون کا فروغ

۶۔ زراعت اور صنعت کا فروغ

عالمی سرمایہ دارانہ پیوستگی سے براءت اور خود کفالت کا حصول

سابقہ حکومت نے اپنے 21 سالہ دور اقتدار میں افغان معیشت کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں پیوست کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس ضمن میں اس کی کامیابی نہایت محدود رہی۔ سرمایہ دارانہ تجارت تو بہت کم فروغ پا سکی۔ سرمایہ دارانہ بھیک جو حاصل ہوئی وہ زیادہ تر ریاستی اشرافیہ (سیاست دانوں اور نوکر شاہی) کی کرپشن کی نذر ہو گئی۔ صنعتی اور مواصلاتی شعبہ میں سامراجی سرمایہ کاری نے فروغ پایا لیکن معیشت میں ان شعبوں کا حجم نہایت محدود ہے۔ بیش تر افغان خود روزگار ہیں اور اپنا رزق خود پیدا کرتے ہیں۔ ان حالات میں قومی خود کفالت کو فروغ دینا ایک قابل حصول ہدف ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومت:

۱۔ ریاستی نوکر شاہی کے ان تمام اہل کاروں کو فی الفور برطرف کر دے جو سابقہ حکومت کی معاشی پالیسی کو وضع اور نافذ کرتے رہے

۲۔ تمام میڈیا اداروں کو کالعدم قرار دے کر ایک قومی نشریاتی ادارہ قائم کرے کیونکہ افغان سرکاری اور نجی میڈیا سامراج کا سب سے اہم آلہ کار رہے اور فواحش اور عریانی پھیلانے کا

کلیدی ذریعہ ہے۔ اور سامراجی متوقع تخریب کاری افغان میڈیا کے ذریعہ ہی ہوگی۔

۳۔ تمام سامراجی امداد اور سرمایہ کاری پر مکمل پابندی عاید کردیں بالخصوص وہ امداد جو اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں (UNICEF,WHO,UNESCO) سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ اقوام متحدہ کے اہل کار امریکا اور یورپی حکومتوں کے تنخواہ دار جاسوس ہوتے ہیں۔

۴۔ سابقہ حکومت کا نافذ کردہ تعلیمی نظام بتدریج معطل کرکے انگریزی کی بالادستی پر مبنی تعلیم غیر قانونی قرار دے دے اور تعلیمی نظام میں اسلامی اصلاحات بتدریج نافذ کرے۔

زراعت اور صنعت کا فروغ

زرعی شعبہ بنیادی طور پر خود کفیل ہے۔ اس میں حکومتی مداخلت صرف اجناس کی کاشت کاری کے فروغ اور پوست کی کاشت کی حوصلہ شکنی تک محدود رہنی چاہیے۔ دیہی علاقوں میں قبائلی نظام کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ طالبان کے فطری حلیف یہی قبائل ہیں اور یہی دہریہ ثقافت اور علمیت سے سب سے کم متاثر ہوتے ہیں۔ قبائلی زعماء کو سیاسی اور معاشی انتظامیہ میں زیادہ سے زیادہ شریک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دیہی اور قبائلی علاقوں میں اور شہری علاقوں میں بھی چھوٹی صنعت اور چھوٹے غیر سرمایہ دارانہ کاروبار کے فروغ پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اسلامی بازار کو وسعت دینا طالبان کی اہم ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔

ملک میں عوامی مذہبیت کو فروغ دینے کے لیے دیہی اور شہری علاقوں میں تصوف کی روایات کا فروغ بھی ضروری ہے اور یہ بھی قبائلی روایات اور افغان دیہی معاشرت کا ایک جزو ہیں۔ تصوف کے عوامی پھیلاؤ کے بغیر دہری معاشرت اور ماڈرن ازم کو افغان زندگی سے معطل کرنا ناممکن ہے۔

تمام بڑی صنعتوں اور کاروباروں کو قومی تحویل میں لے لینا چاہیے اور ان کے سامراجی سرمایہ دارانہ روابط کو فی الفور معطل کردیا جائے۔ ملک میں ایک وسیع معاشی انتظامیہ قائم کی جائے جس میں طالبان کے علاوہ دیگر اسلامی گروہوں کے افراد اور قبائلی بھی شامل ہوں اور جس کی انتظامی شاخ ہر بڑے کاروبار، دفتر اور کارخانہ میں موجود ہو۔ بڑی صنعتوں میں نجی سرمایہ کاری ممنوع قرار دی جائے۔

ایک جہادی ریاست کا استحکام

ہر بڑی صنعت اور کاروبار دفاعی شعبہ سے منسلک ہو اور ہر افغان کے لیے فوج میں شرکت

لازمی قرار دی جائے۔ طالبان کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ سامراجی جارحیت کا خاتمہ نہیں ہوا اور سامراجی علاقائی خانہ جنگی کو فروغ دینے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ لہٰذا دفاعی شعبہ کو معیشت کا اہم ترین ذریعۂ فراہمی ملازمت اور وسیلۂ ارتقا بنانے کی ضرورت ہے۔ امارت اسلامیہ کا استحکام لازمی فوجی ٹریننگ پر بڑی حد تک منحصر ہے۔ طالبان نے ایک عوامی جنگ (peoples war) جیتی ہے اور اس جنگ کے انتظامی ڈھانچہ کو برقرار رکھنے کے لیے عام لام بندی ضروری ہے اور یہی لازمی فوجی ٹریننگ طالبان کی صفوں میں اضافہ کا ذریعہ ثابت ہو گی (ان شاء اللہ)۔ ملک میں عام لازمی فوجی ٹریننگ غیر اسلامی جمہوری معاشرتی اور ادارتی رجحانات کو کچلنے میں بھی ایک اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

ایک جہادی ریاست کے استحکام کے لیے ہتھیاروں میں خود کفالت کا حصول بہت اہم ہے لہٰذا بڑی صنعتوں میں بھاری صنعتوں کو فروغ دینا بہت ضروری ہے۔ بالخصوص اسٹیل، توانائی (electricity) اور مواصلات (IT) سے متعلق صنعتیں۔ یہ صنعتیں افغانستان میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس ضمن میں ایران اور ترکی سے اشتراک عمل (joint venture) بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

زری اور مالیاتی پالیسی

۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء امارت اسلامیہ کی معاشی حکمت عملی کا سب سے کمزور پہلو اس کی زری پالیسی رہی۔ بیرونی کرنسیاں بالخصوص پاکستانی روپیہ اور امریکی ڈالر افغان معیشت میں گردش کرتی رہیں اور کرنسی تاجران کے سودی کاروبار پر حکومتی کنٹرول واجبی سا تھا۔ اسی طرح حکومتی سرمایہ کاری بھی نہایت محدود رہی۔ لہٰذا حکومت کی معیشت پر گرفت نہایت مجہول تھی۔ لہٰذا جتنی جلدی ممکن ہو:

۱۔ طالبان کو افغان کرنسی (افغانی) کو منسوخ کر کے افغانی میں کاروبار کو بتدریج معطل کر دینا چاہیے۔

۲۔ اس کے برعکس ملک میں ایک نئی کرنسی (اسلامی دینار) کا ملک کی ترسیلی ضروریات کے مطابق اجراء عمل میں لانا چاہیے۔

۳۔ اسلامی دینار کی رسد (supply) کا تعین موجود زری ترسیل کے مطابق ہو اور

ابتداء میں اس کی شرح تبادلہ (exchange value) سے منسلک ہو۔

۴۔ اسلامی دینار ایک غیر سودی کرنسی ہو جس کی شرح تبادلہ کسی شے (سونا، چاندی، ڈالر، پاکستانی روپیہ) سے منسلک نہ ہو۔ اس کی رسد کی مقدار اور شرح تبادلہ معیشت کی پیداواری اور ترسیلی ضروریات کے حکومتی تخمینوں کے مطابق طے کی جانی چاہیے (ہر تین ماہ میں)

۵۔ سود اور سٹہ کے ہر قسم کے کاروبار پر مکمل پابندی عاید کی جائے۔

۶۔ اسلامی دینار کے علاوہ کسی غیر کرنسی (افغانی، ڈالر، روپیہ) کا ملکی پھیلاؤ (circulation) روکنے کا انتظام کیا جائے اور ان کرنسیوں کو استعمال کرنے والوں کو سخت ترین سزائیں دی جائیں۔

۷۔ غیر کرنسیوں کے استعمال پر تحدید نافذ کرنے کی ذمہ داری فوج کے سپرد کی جائے اور یہ فوج کی اہم ترین ذمہ داریوں میں شامل ہو۔

۸۔ تمام بینکوں، انشورنس کمپنیوں اور کرنسی کی تجارت کا کاروبار حکومتی تحویل میں لے لیا جائے۔

۹۔ ایران کے ساتھ ایک کرنسی یونین (currency union) بنانے کی مشاورت شروع کی جائے۔

۱۰۔ حکومت محصولات میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے۔ محصولات کی مقدار محصولیاتی سکت (taxable capacity) کے سالانہ تخمینہ کے مطابق کی جائے۔

۱۱۔ اسلامی دینار کے اجراء کو حکومت کی سرمایہ کارانہ ضروریات کے مطابق متعین کیا جائے۔

۱۲۔ تمام حکومتی بڑی صنعتیں حصول منافع کے اصول کے مطابق چلائی جائیں اور ان سے حاصل شدہ منافع حکومتی معاشی وسائل کا بڑھتا ہوا حصہ ہو۔

۱۳۔ زراعت اور دیگر نجی کاروبار میں مشارکت اور مضاربت کی بنیاد پر کاروبار کو فروغ دیا جائے۔

علاقائی تعاون

امارت اسلامیہ کا فطری حلیف ایران ہے کیونکہ وہاں بھی ایک اسلامی حکومت قائم ہے اور ایران بھی افغانستان کی طرح مدت دراز سے سامراجی دہشت گردی کا شکار ہے۔ ایک معنیٰ میں

طالبان کی فتح انقلاب ایران کا تسلسل ہے اور امام خامنائی اور حجۃ الاسلام رئیسی کی قیادت میں اس بات کا امکان کسی نہ کسی حد تک موجود ہے کہ ایران کو اس بات کا احساس ہوگا کہ اس کی سالمیت افغانستان میں اسلامی نظام کے استحکام پر منحصر ہے۔ ایک مشترکہ کمیشن برائے معاشی اور دفاعی تعاون ایران اور افغانستان میں جلد از جلد قائم کیا جائے۔ جس کا فوری مقصد دونوں ممالک میں تجارت اور سرمایہ کاری اور جہادی شعبہ میں تعاون ہو۔ درمیانی مدت میں ایران اور افغانستان میں ایک کرنسی یونین کے قیام پر بھی غور کیا جاسکتا ہے جو افغانستان کی بھاری صنعتوں اور آئی ٹی سیکٹر کے فروغ کے لیے بھی نہایت مفید ثابت ہوسکتا ہے اور ایرانی تیل کے بدلے افغان زرعی اشیاء کی تجارت بھی تیزی سے ترقی کر سکتی ہے۔ افغانستان ایران پر سامراجی پابندیوں کو توڑنے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ آذر بائیجان کو بھی غیر رسمی طور پر اس قسم کے تعاون پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔

ترکی اور پاکستان کا معاملہ مشتبہ ہے۔ یہ دونوں ممالک امریکا کے حلیف ہیں اور رہیں گے اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ امریکی سامراج ان ممالک سے فراہم شدہ امداد کو افغانستان میں تخریب کاری کے لیے استعمال کرے۔ پھر بھی تحفظات کے ساتھ پاکستان اور ترکی سے تعاون کو فروغ دینے کی جدوجہد فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہے۔ بالخصوص پاکستان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ امارت اسلامیہ نے اس کی مغربی سرحدیں محفوظ کر دی ہیں۔

ایک طاقتور غیر سرمایہ دارانہ قومی معیشت کا قیام طالبان کو سامنے آنے والے چیلنجز میں شاید سب سے بڑا چیلنج ہے۔ ان شاء اللہ وہ اس محاذ پر بھی کامیاب ہوں گے اور دنیا میں ایک قومی غیر سرمایہ دارانہ معیشت قائم کرنے میں کامیاب ثابت ہوں گے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جو نہ روس انجام دے سکا نہ چین نہ ویت نام نہ شمالی کوریا۔ یہ ایک نئے دور کا آغاز ہے۔

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طغیانیاں موج کی کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے

افغانستان کی آبادی 40 ملین ہے۔ اس کی سالانہ مجموعی پیداوار بیس بلین ڈالر (ورلڈ بینک کے تخمینے کے مطابق) سے کہیں زیادہ ہے۔ افغانستان کے لیے ایک غیر سرمایہ دارانہ خود کفالتی معاشی حکمت عملی کا اختیار کرنا بالکل ممکن ہے۔

افغانستان　　　　سید خالد جامعی

ترقی کا مغربی ماڈل اور طالبان

لبرل استعماریت کا ایک حربہ یہ بھی ہے کہ کوئی معاشرہ ترقی کے عقیدے کو قبول کرلے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ترقی کا عقیدہ معاشرے کے دوسرے تمام عقیدوں کو خود تحلیل کردے گا۔ انقلابِ فرانس، انقلابِ امریکہ، انقلابِ روس، انقلابِ چین اور انقلابِ ایران ان پانچوں انقلابوں میں انقلابیوں نے اپنی فوج کے ذریعے ریاستی افواج کو شکست دی۔ طالبان نے تنہا نیٹو، امریکہ اور افغان قومی فوج کو بیک وقت شکست دی۔ کیا اب وہ اپنی فوج کے سوا دوسری فوج کو باقی رکھیں گے یا نہیں؟ تیسری دنیا میں استعماری فوج ہی سب سے بڑا خطرہ ہے۔

مغرب جس نے عورت کو احترام کے ہر دائرے سے خارج کیا وہ کہہ رہا ہے کہ طالبان کو عورت کا احترام کرنا ہوگا۔ عورت کیا کرے؟ کیا یہ استعمار ہی بتائے گا یا اسلام بتائے گا؟ سائنس وٹیکنالوجی کا نہ ہونا طالبان کی قوت تھی یا کمزوری؟ عالم اسلام کی وہ اسلامی تحریکیں، بعض علماء اور اسلامی مفکرین جو سو سال سے عوام کو درس دے رہے ہیں کہ سائنس کا مقابلہ، سائنس ٹیکنالوجی کا مقابلہ، ٹیکنالوجی اور علم کا مقابلہ علم سے ہوتا ہے، وہ امت کو یہ نہیں بتا سکے کہ ایمان دنیا کی ہر جہالت کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ ایمان نے سائنس وٹیکنالوجی کو شکست دے دی۔ طالبان کی فتح کے دو اہم سبب ہیں: ایک تو یہ کہ انہوں نے سائنس وٹیکنالوجی پر ایمان لانے کی بجائے اپنے ایمان پر بھروسہ کیا اور دوسرا سبب ابن خلدون کے الفاظ میں انہوں نے عیاشی کے بجائے جفاکشی کی زندگی اختیار کی۔ اگر وہ ماڈرن ازم کے ماڈرن لائف اسٹائل کو اختیار کرتے تو کیا وہ بیس سال تک دنیا کے چالیس ملکوں کی فوج سے لڑ سکتے تھے؟ کیا وجہ ہے کہ عالم اسلام میں مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی سائنس کے بغیر چاند تک نہیں دیکھ سکتی اور کہتی ہے کہ ہم سائنس سے پوچھتے ہیں کہ جو چاند پیدا ہو گیا وہ نظر آ سکتا ہے یا نہیں؟ ہم سائنس کو پہلے مانتے ہیں شہادتوں کو بعد میں لاتے ہیں تو کیا وہ طالبان سے کوئی سبق سیکھنے کے لیے تیار ہیں؟

کابل ماڈرن ازم اور لبرل استعماریت کا تیار کردہ ماڈل ہے جسے مغرب پورے افغانستان تک وسیع کرنے کا خواہش مند ہے۔ ماڈرن استعمار کے عناصر اسی شہر میں نظر آتے ہیں، اس کے سوا

افغانستان جدیدیت کے اثرات سے خالی ہے۔کیا طالبان اپنی ولیج ڈیموکریسی، جرگے اور پنچائتکے قاضی نظام کی جگہ جدید ریاستی عدالتیں قائم کریں گے یا قدیم روایتی نظام کی اصلاح کر کے اسے مضبوط و مستحکم بنائیں گے اور جدید شہروں سے بچیں گے؟ عائشہ جلال کہتی ہے کہ پاکستان بھارت سے روایتی جنگ نہیں لڑسکتا کیونکہ بھارت کی فوج کے وسائل اور ذرائع نقل و حمل سب کچھ پاکستان سے کئی گناہ زیادہ ہیں اسی لیے پاکستان ایٹم بم استعمال کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔سوال یہ ہے کہ طالبان نے جنگ میں کامیابی کیسے حاصل کی اور ہم اس سے کوئی سبق لے سکتے ہیں یا نہیں؟

طالبان کے لیے سب سے بڑا امتحان جدید سرمایہ داری اور اس کے اداروں کی قبولیت ہے۔افغانستان میں بینکاری نظام بہت کمزور ہے اسی لیے ایرانی امداد افغان فوج کا کمانڈر انچیف نقد رقم تھیلوں کے ذریعے وصول کرتا تھا۔اشرف غنی بھاگتے ہوئے تین گاڑیوں اور ایک ہیلی کاپٹر میں ڈالر لے گیا۔امریکہ کے لیے جاسوسی کرنے والوں کو جیسے ہی نقد رقم ملتی طالبان کو پتہ چل جاتا تھا۔بینکاری نظام بڑے پیانے پر آیا تو اس کے نقصانات کا ازالہ کیسے ہوگا؟ لبرل استعماریت کے ذہنی،فکری تربیتی مراکز سکول کالج یونیورسٹی ہیں۔اس نظام کے ذریعے مغربیت،جدیدیت اسلام میں اور اسلامی تحریکوں میں بھی شامل ہو جاتی ہے۔کیا اس نظام کا کوئی متبادل ہے یا نہیں؟

امریکہ سوچ رہا ہے کہ افغانستان کو سعودی ماڈل کی ریاست بننے دے تاکہ طالبان خود تبدیل ہو جائیں اور ان کے اندر سے شاہ سلمان پیدا ہو۔دنیا میں ترقی کا کوئی ماڈل خواہ ایرانی، ترکی،سعودی،امریکی،یورپی اور چینی ہو قرضے،سود،سٹے،بھیک اور خیرات کے بغیر کام نہیں کرسکتا اور قرضے مغربی اقوام سے ہی لینے پڑتے ہیں یا ان کے استعماری حاشیہ برداروں سے۔کیا طالبان ترقی کے اس استعماری لبرل ماڈل کو قبول کریں گے؟

ملا عمرؒ نے امارت کو جس سادگی اور کفایت شعاری کے ساتھ چلایا تھا کیا طالبان اس نمونے کی تقلید کریں گے اور شاہی محلات کو فلاح عامہ کے اداروں میں تبدیل کر دیں گے؟ افغانستان شاید وہ آخری مقام ہے جہاں ابھی تک اسٹیٹ بلڈنگ نہیں ہوسکی۔افغانوں نے تین سپریم طاقتوں اور تین ٹیکنالوجیکل قوتوں روس،امریکہ اور برطانیہ کو اپنے ایمان سے شکست دی ہے۔روایتی تہذیب،معاشرت،معیشت، نظام عدالت، مشاورت، پنچائت اور جرگے کیسے ہوتے ہیں؟ مقامی مسائل کیسے حل ہوتے ہیں؟ اس کی مثال افغانستان ہے۔کیا طالبان اس افغانستان کا

احیاء کر کے لبرل استعماریت کو شکست دے سکیں گے جو دنیا بھر میں اپنے لائف اسٹائل سے تہذیبی اقداری، معاشی، معاشرتی تبدیلیاں پیدا کر رہی ہے؟ کیا طالبان روزگار معیشت کے قدیم روایتی طریقوں کو اختیار کریں گے تاکہ معیشت جدید معاشی سرمایہ دارانہ اداراتی صف بندی سے باہر رہے یا وہ دیہاتوں سے شہروں کی طرف کوچ کرنے کی مغربی قدر کو اختیار کریں گے اور روزگار فراہم کرنے کی ذمہ داری عاقلہ، عصبہ، قبیلے اور برداری سے اٹھا کر امارت کو منتقل کر دیں گے جیسا کہ جدید ریاست اور ماڈرن ازم نے کیا ہے؟

بقیہ: ملا عمرؒ کی اسلامی تحریک۔ہمارے لیے رول ماڈل

یہ ساری صورتِ حال مغرب کی مادہ پرست تہذیب کی نقالی اور سیکولر طرز فکر اختیار کرنے کا نتیجہ ہے۔طالبان کی اسلامی تحریک سارے مسلمان ممالک کے لیے یہ پیغام لائی ہے کہ اللہ کے علاوہ ساری غلامیوں سے انکار کرو تو اللہ خیر کے ایسے سرچشمے جارے کرے گا کہ تمہارے سارے مسائل ومصائب سے نکلنے کی صورت پیدا ہوگی اور تمہارے اندر وہ ایمانی قوت پیدا ہوگی کہ تم مغرب سے ہدایات لینے کی بجائے ان کو اسلام کے لیے پاکیزہ طریقہ زندگی کی طرف لانے کا ذریعہ ثابت ہو گے۔

مبارکباد

کابل پُرامن فتح ہونے پر ہم نے افغان طالبان اور امت مسلمہ کو فیس بک پر مبارک باد دی اور افغان شہداء کو سلام پیش کیا۔اس پر ہمارا فیس بک پیج ایک ماہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ہم نے ملی مجلس شرعی کے پلیٹ فارم سے سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کی طرف سے دو بار طالبان کی حمایت میں اجلاس بلوایا اور قرار دادیں منظور کرا کر پریس بھجوائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ افغان مجاہدین کی فتح اور عالم کفر کے آئمہ کی شکست اس صدی کا ایک عظیم الشان اور منفرد واقعہ ہے اور اس کے دوررس اثرات تاریخ عالم پر اور مسلم امہ پر پڑیں گے۔یقیناً اس سے امریکی اور یورپی زوال کی مضبوط ابتدا ہوگئی ہے اور اس فتح سے مسلم امہ کے سوئے ہوئے لوگ جاگیں گے اور متحرک ہوں گے، ان شاء اللہ۔

افغانستان　　ڈاکٹر محمد امین

افغان انقلاب - پاکستان پر اثرات

پاکستانی حکمرانوں اور دینی عناصر کو طالبان سے سبق سیکھنا ہوگا

۱۔ بظاہر افغانستان کے حالات پاکستان سے مختلف ہیں اور ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ افغانستان میں طالبان پہلی دفعہ روس اور امریکہ کے پیدا کردہ انتشار، فساد اور انارکی کو طاقت سے ختم کرنے پر اقتدار میں آئے تھے اور اس دفعہ وہ بیس سال تک امریکہ و یورپ کے خلاف جہاد کر کے کامیاب ہوئے ہیں اور صاحب اقتدار ہونے کی وجہ سے نفاذ شریعت ان کی قانونی ذمہ داری ہے۔

اس کے برعکس پاکستان کے حالات پرامن ہیں۔ یہاں حکمران ہمیشہ مغرب زدہ رہے ہیں اور وہ مغربی فکر و تہذیب کے مطابق ملک کو چلانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ نفاذ شریعت کبھی ان کی خواہش نہیں رہی۔ اور بدقسمتی سے یہاں علماء کی اکثریت نے مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب سے مفاہمت اور تلفیق کی پالیسی اختیار کی۔ مغرب کی جمہوریت کو کچھ اسلامی پھول سنگھا کر انہوں نے اسے مشرف بہ اسلام کرلیا اور اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا۔ ادعا ان کا یہی تھا کہ وہ اس طرح برسر اقتدار آ کر شریعت نافذ کرسکیں گے لیکن عملاً ایسا نہ ہوا اور ہمارے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

خلاصہ یہ کہ افغانستان اور پاکستان کے سیاسی حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور بظاہر ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ پاکستان اور افغانستان کے سیاسی حالات اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کرسکتے ہیں، ایک دوسرے سے سیکھ سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ شعوری خواہش نہ ہونے کے باوجود دونوں حالات کے جبر کے تحت غیر شعوری طور پر ایک دوسرے سے متاثر ہوں۔ ہم ان تینوں صورتوں کا مختصر ذکر کریں گے۔

ایک دوسرے کی مدد

پاکستان کے معاشی حالات اگرچہ اچھے نہیں لیکن افغانستان تو جنگ سے تباہ حال ہے اور

وہاں بہت سے شعبوں میں صفر سے کام کرنا ہوگا۔اس کا بھی امکان ہے کہ دشمن قوتیں اسے معاشی طور پر مزید تباہ کرنے کی کوشش کریں۔ان حالات میں پاکستان افغانوں کی بہت مدد کرسکتا ہے، خود بھی اور علاقائی قوتوں اور مسلم ممالک کو متحرک کرکے بھی اور پاکستان کو یہ ضرور کرنا چاہیے۔ بلکہ پاکستان اسے دوطرفہ تعاون کی شکل دے کر بہت سے دینی، سیاسی، معاشی اور جغرافیائی فوائد خود بھی حاصل کرسکتا ہے خصوصاً وسط ایشیا کے مسلم ممالک سے تعلقات بڑھا کر، علاقائی طور پر مسلم بلاک بنا کر اور چین وروس کے ساتھ مفاہمت سے خطے میں اہم کردار ادا کر کے۔

تاہم ہمارا حکومتی ڈھانچہ چونکہ اسلامی نہیں لہٰذا ہماری حکومت کی طرف سے مہیا کردہ افرادی قوت افغان طالبان کے لیے نظریاتی مسائل پیدا کرسکتی ہے لہٰذا بہتر ہوگا کہ پاکستان کے اسلامی عناصر بھی حرکت میں آئیں اور اسلامی ذہن کی افرادی قوت طالبان کو مہیا کرنے میں دلچسپی لیں۔ وہ اس کام میں اسلامی جذبہ سامنے رکھیں نہ کہ مالی مفادات۔الحمدللہ! پاکستان میں ہر شعبۂ زندگی میں اسلامی ذہن کے افراد موجود ہیں جو یہاں کے حالات کی بناء پر کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے ہیں یا غیر مؤثر ہیں۔

یہاں ہم نے معاشی پہلو کا ذکر محض بطور مثال کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ طالبان کے ساتھ یہ تعاون ہمارے حکمرانوں اور دینی عناصر کو سارے شعبہ ہائے حیات میں کرنا چاہیے۔

شعوری طور پر سبق سیکھنا

ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کو افغان طالبان کی کامیابی سے یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ امریکہ ویورپ کو لڑ کر شکست دی جاسکتی ہے۔لہٰذا مغرب کے مقابلے میں ہمیشہ دب کر رہنے کی پالیسی اور اس سے مرعوب ہوکر رہنے کی پالیسی ضروری نہیں ہے۔ اگر افغانوں جیسے کم وسیلہ چند ہزار مجاہدین اور ۴ کروڑ لوگ امریکہ ویورپ کو اپنے جذبے، ایثار اور جہد مسلسل سے شکست دے سکتے ہیں تو پاکستان کی آبادی تو ۲۲ کروڑ ہے اور اس کے پاس دنیا کی بہترین تربیت یافتہ چھ لاکھ فوج موجود ہے (چار لاکھ دیگر دفاعی وینم دفاعی افواج کے علاوہ) تو ہمیں مغرب سے ڈرنے یا اس کے آگے جھکنے یا اس کی ہر صحیح غلط بات کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو ایمان کی جنگ ہے، یہ تو اعصاب کی جنگ ہے۔ ہمیں اس میں دبنے، ڈرنے اور جھکنے کی ضرورت نہیں۔

اس میں ہماری دینی جماعتوں کے لیے بھی سبق ہے اور وہ یہ ہے کہ افغان مجاہدین مغرب کے خلاف کبھی کامیاب نہ ہوتے اگر انہیں افغان عوام کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔ اس حمایت کے بغیر تو گوریلا جنگ لڑی ہی نہیں جاسکتی۔ ان کی کامیابی کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ یک مشت، یکسو اور یک جان تھے، متحد تھے، انہیں اپنی قیادت پر اعتماد تھا اور وہ اس کے فرمانبردار اور جانثار تھے۔ اس کے برعکس پاکستان کی دینی جماعتیں پاکستانی عوام کی حمایت سے محروم ہیں۔ عوام انہیں ووٹ دینے اور انتخابات میں ان کی حمایت کرنے کو تیار نہیں۔ اس کے اسباب کیا ہیں اور دینی عناصر کس طرح عوام کی حمایت حاصل کر سکتے ہیں؟ اس پر تفصیلی بحث کا یہ محل نہیں لیکن اتنی بات کہے بغیر چارہ نہیں کہ ہماری دینی قوتوں نے فرد کی تعمیر سیرت اور اس کی اسلامی تعلیم و تربیت پر محنت کی ہی نہیں۔ نفاذ شریعت اور اسلامی انقلاب کے نعرے لگانے سے تو بہر حال اسلامی انقلاب آنہیں جاتا جب تک کہ آپ فرد پر محنت نہ کریں اور اس کی اسلامی تربیت کر کے اسے اپنا ہم خیال نہ بنائیں اور معاشرے کی اصلاح نہ کریں۔

دوسرا سبق جو ہماری دینی سیاسی جماعتوں کو طالبان سے سیکھنا چاہیے وہ ایک قیادت کے تحت متحد رہنا ہے۔ ہماری دینی سیاسی جماعتیں متحد ہونے کو تیار نہیں۔ وہ سیکولر سیاسی جماعتوں سے تو اتحاد کر لیتی ہیں لیکن آپس میں باہم لڑتی رہتی ہیں اور نفاذ شریعت جیسے بنیادی اور غیر اختلافی مسئلے میں بھی متحد ہونے کو تیار نہیں۔ یہ ان کی ناکامی کی ایک بنیادی وجہ ہے اور انہیں اتحاد کا یہ سبق طالبان افغانستان سے ضرور سیکھنا چاہیے۔

لاشعوری اثرات

اگر ہمارے حکمرانوں اور ہماری دینی جماعتوں نے شعوری طور پر افغان طالبان کی جدوجہد سے سبق نہیں سیکھا اور طالبان کو اگلے چند سال افغانستان میں حکومت کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ ڈیلیور کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں تو پاکستان کے حکمران اور علماء، چاہیں نہ چاہیں، ان پر اس کے اثرات پڑیں گے۔ اگر طالبان افغانستان میں کامیابی سے شریعت نافذ کر دیتے ہیں اور اس کے اچھے اثرات وقوع پذیر ہوتے ہیں تو پاکستانی حکمرانوں پر بالواسطہ ہی سہی، ضرور دباؤ بڑھے گا کہ وہ بھی شریعت نافذ کریں۔

اسی طرح اگر افغانستان میں نفاذ شریعت کے خوشگوار اثرات پیدا ہوتے ہیں تو پاکستانی

عوام اور اہل دانش جلد یا بدیر علماء سے یہ ضرور پوچھیں گے کہ آپ لوگوں نے مغربی جمہوریت کو کیوں قبول کیا اور آپ کو اس سے کیا حاصل ہوا؟ کیا اسلامی جمہوریت سے یہاں اسلام نافذ ہوا ہے؟ اگر نہیں ہوا تو آپ ۷۴ سال سے اس سے کیوں چمٹے ہوئے ہیں؟ اور یہ بھی کہ طالبان نے متحد ہو کر بازی جیت لی، آپ لوگ متحد کیوں نہیں ہوتے؟ آپ لوگ نفاذ شریعت کے لیے اپنے مسلکی اختلافات کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر آج نہیں تو چند سال بعد یہ سوال ضرور سامنے آئیں گے اور دینی عناصر کو ان کا جواب دینا ہوگا اور جب وہ اس پر سوچیں گے تو انہیں اپنے مؤقف پر نظر ثانی بھی کرنا ہوگی۔

خروج اور بغاوت۔قیاس مع الفارق

جیسا کہ ہم نے ابتداء میں کہا کہ افغانستان اور پاکستان کے حالات میں بنیادی فرق ہے لہٰذا افغان طالبان جس طرح اپنے ہاں اسلام نافذ کر سکتے ہیں، ہم پاکستان میں ایسا نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں کفار نے حملہ نہیں کیا کہ ہم دفاعی جہاد کریں۔ پاکستان کے مسلم حکمران اگر غیر صالح ہیں تو بھی وہ کفر بواح کے مرتکب نہیں ہوئے کہ ان کے خلاف خروج جائز ہو جائے۔ پاکستان کا آئین بڑی حد تک (گو پوری طرح نہیں) اسلامی ہے اور حکمرانوں میں سے بھی کسی کو خلاف اسلام بات کرنے کی ہمت نہیں۔ پھر یہ کہ پاکستان جیسی ریاست میں جتنی مضبوط اور منظم فوج جتنی بڑی تعداد میں موجود ہے، اس کی موجودگی میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں کوئی پرائیویٹ گروہ اسے شکست دے کر ملک پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اور اگر کوئی یہ احمقانہ حرکت کرے بھی تو اپنا نقصان کرے گا، معاشرے میں فتنہ وفساد پھیلانے کا مرتکب ہوگا اور ملک وملت کو کمزور کرے گا۔ خروج کا ہمارے معاشرے میں اس لیے بھی جواز نہیں کہ یہاں معاشرہ کھلا ہے، ہر کوئی دینی دعوت واصلاح کا کام کر سکتا ہے۔ اسلامی تعلیم وتربیت، دعوت وتبلیغ اور سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے پر کوئی پابندی نہیں اور انتخابات کی وجہ سے عملاً حکومتیں بدلتی رہتی ہیں تو دینی عناصر کی ناکامی ان کے باہمی انتشار، فرقہ بندی، عدم اتحاد، فرد کی تعمیر سیرت اور اصلاح معاشرہ کا کام نہ کرنے کی وجہ سے ہے اس لیے یہاں خروج کا کوئی جواز بنتا ہی نہیں۔ لہٰذا پاکستان میں کسی دینی عنصر کو اس طرح کی سوچ کو پروان چڑھانا ہی نہیں چاہیے۔

جہاں تک تحریک طالبان پاکستان کا تعلق ہے تو اس کا ذکر بھی یہاں... (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۳)

استفسارات　　مدیر

اسلامی تحریکیں کیوں کامیاب نہیں ہو سکیں؟

مستفسر

میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرے خط کا جواب البرہان (شمارہ اگست) میں دیا، جو اگرچہ مختصر تھا لیکن بہر حال بات آپ کی صحیح اور اہم تھی کہ ناکامیوں کے اسباب کا تجزیہ و تحقیق ضروری ہے۔ یہ کام تحریک کے قائدین و کارکنان کو خود بھی کرنا چاہیے اور دوسروں کے تجزیہ و تنقید سے بھی استفادہ کرنا چاہیے لیکن لگتا یہ ہے کہ تحریک اسلامی کے قائدین و کارکنان اس کے لیے تیار نہیں۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ اگست ۲۰۲۱ء کے ترجمان القرآن میں پروفیسر خورشید صاحب نے اداریہ لکھا اور کارکنوں کو جوش دلایا کہ وہ غلبۂ دین کے لیے خوب محنت کریں، جو بہت اچھی بات ہے لیکن وہ سوال تو رہ گیا کہ کارکن پچھلے اسی (۸۰) سال سے جو محنت کر رہے ہیں اس کے مثبت نتائج کیوں نہیں نکلے؟

اسی طرح اس شمارے میں پروفیسر سلیم منصور خالد صاحب نے اقامت دین سے متعلق مولانا مودودیؒ علیہ الرحمۃ کی تحریروں کا گلدستہ سجایا جو بہت خوب ہے لیکن اس سوال پہ غور کون کرے گا کہ دینی تعلیمات کے تقاضوں پر عمل اگر تحریک اسلامی کے متعلقین خود نہ کریں یعنی اپنی ذاتی زندگی میں دین قائم نہ کریں تو معاشرے اور ریاست میں دین کی اقامت کیسے ہو گی؟ اور یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ معاشرے اور ریاست میں اقامت دین کے لیے جو حکمت عملی اپنائی گئی تھی وہ مناسب تھی بھی یا نہیں؟ میری اس اپروچ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

البرہان

مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی تحریکیں اپنے فکر و عمل اور اپنی حکمت عملی پر جرأت مندانہ نظر ثانی کریں۔ تجربات اور غلطیوں سے سبق سیکھنا اور ضرورت ہو تو اپنے لائحہ عمل کو تبدیل کر لینا ہی بہترین حکمت عملی ہوتی ہے۔ معاشرے اور ریاست کی سطح پر اقامت دین بلاشبہ اہم ہے لیکن میری رائے میں فرد کی زندگی میں اقامت دین

اہم تر ہے بلکہ اجتماعی تبدیلی کی اساس بھی فرد کی تبدیلی ہی ہوتی ہے لہٰذا اس بات پر از سرِ نو غور کرنا ضروری ہے کہ تحریک کے کارکنوں کی ذاتی زندگی میں اور مدعو عوام کے افراد کی ذاتی زندگی میں مطلوب اسلامی تبدیلی کیوں نہیں آسکی؟ یا جو آئی تھی وہ دیر پا کیوں ثابت نہیں ہوئی؟ اس سلسلے میں تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس اور دعوت واصلاح کے نبوی منہاج پر عمل درآمد کے حوالے سے بھی غور ہونا چاہیے کہ کس حد تک اس پر عمل ہوا؟ یا اب اسے کیسے حرزِ جاں بنایا جا سکتا ہے؟

تبصرۂ کتب　　　مدیر

'دینی مدارس۔ تعلیم وتربیت اور نصاب ونظام'

از مولانا ڈاکٹر حشمت علی صافی

دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے کئی نوجوان علماء نیا دینی مدرسہ اور مسجد قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے اکثر سنی سنائی باتوں یا اساتذہ کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح بعض چھوٹے مدارس بھی اکثر ترقی کر کے مزید آگے بڑھنا چاہتے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی رہنما تحریر موجود نہ تھی۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مدارس کے بعض ذہین طلبہ جب یونیورسٹی جاتے ہیں اور باہر کی دنیا کے تجربات سے آگاہ ہوتے ہیں تو وہ خود جو دینی مدرسہ چلاتے ہیں تو اپنی روشن خیالی سے اس کے نظام میں بہتری لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا ڈاکٹر حشمت علی صافی کی یہ تحریری کاوش اسی نقطۂ نظر کی عکاس ہے۔ انہوں نے نہ صرف جامعہ تبلیغ القرآن پشاور میں کئی اصلاحات کیں بلکہ دیگر نوجوان فضلاء اور مدارس کے لیے یہ کتاب مرتب کر دی ہے جو دینی مدرسہ چلانے کے حوالے سے عملی اور انتظامی رہنمائی کرتی ہے (فکری مباحث کم ہی چھیڑے گئے ہیں)۔ یہ کتاب ہر دینی مدرسہ کی ضرورت ہے اور العلم پبلی کیشنز پشاور (091-2580325) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

CPL No. 296 September 2021

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

	قیمت
ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۶۰۰
اسلامی سکول کے خدوخال	۱۵۰
تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۳۰۰
یکساں قومی نصاب۔خدشات و مضمرات	۲۵۰
تدریس القرآن ① برائے معلمین (ڈاک خرچ)	۵۰
تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات (ڈاک خرچ)	۵۰
پنج سورہ (اُردو تفہیم) (ڈاک خرچ)	۵۰
اسلامی علوم میں تحقیق: اصول، ترجیحات اور معیار	۳۵۰
ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت (زیرِ طبع)	

طلبہ کی اسلامی تربیت

تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۲۵۰
تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ہینڈ بک و گائیڈ	۳۰۰

اصلاحِ دینی مدارس

ہمارا دینی نظام تعلیم	۴۵۰
نصابِ مدنیؒ	۸۰
مدرسہ ڈسکورسز۔مطالعہ وتجزیہ	۲۵۰
اصلاحِ دینی مدارس	۴۰۰

اسلامی تحریکیں

پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۳۰۰

	قیمت
ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت (ڈاک خرچ)	۴۰
خاموش انقلاب۔ناگزیر ہے	۳۵۰
عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۱۵۰

تزکیۂ نفس

اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۱۵۰۰
حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۸۰
اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۸۰
ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۳۵۰
اسلام اور تعمیر سیرت (زیرِ طبع)	

مغربی فکر و تہذیب

اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۳۵۰
اسلام اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۲۵۰
اسلام اور ردِ مغرب	۳۰۰

فہم دین

مسلم نشاۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل	۴۷۵
مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۱۰۰۰
مقالاتِ امین (جلد دوم)	۱۰۰۰
شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۵۰

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com